ISSN 2321-4627

اکتوبر 2022ء

-/15روپے

ماہنامہ قومی زبان حیدرآباد

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی و تہذیبی جریدہ

QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad

خصوصی شمارہ

اُردو کے غیر مسلم ادبا و شعراء

مندرجہ ذیل غیر مسلم ادباؤ شعراء، صحافی اور غیر مسلم اردو اسکالرس کے نام ''اردو کے نان مسلم شعرا و ادیب'' مرتبہ ڈاکٹر جگدیش مہتہ درد حصہ اول جولائی 1981ء و حصہ دوم اکتوبر 1975ء مطبوعہ نیو پبلک پریس دہلی و جمال پرنٹنگ پریس جامع مسجد دہلی سے نقل کئے گئے ہیں۔

قارئین اور عوام الناس کی معلومات کے لئے یہ نام یہاں درج کئے جا رہے ہیں:

منشی پریم چند، کرشن چندر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، جوش ملسیانی، میلا رام وفا، سردار اودے سنگھ شائق، فراق گورکھپوری، گوپی ناتھ امن لکھنوی، برہم ناتھ دت قاصرؔ، چاند بہاری لال صبا، منوہر لال کپور طالب چکوالی، ڈاکٹر منوہر سہائے انور، پنڈت آنند نارائن ملاؔ، شیام موہن لال جگر بریلوی، اوپندر سنگھ موتیؔ، چاند نرائن رائنہ چاندؔ، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہؔ، پرمانند سروپ اثر سکندر آبادی، نیسو رام آنند کلوی، درگا داس قاصرؔ، بھوانی داس ثمر ملتانی، نرائن داس طالب پانی پتی، بلونت سہائے کنولؔ، بنواری لال نسیم: جیمنی سرشارؔ، بھاگیرتھ لال زخمی حصاری، رام رتن مضطرؔ، امر چند قیس جالندھری، رام کشن تمنا انبالوی، نوبہار صابرؔ، پنڈت رام پرتاب اکملؔ جالندھری، گوردیال چند بسملؔ کپورتھلوی، گوپال متلؔ، پنڈت بالمکند عرشؔ ملسیانی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ، سردار پورن سنگھ ہنرؔ، ایس۔ ایل۔ بخشی اختر امرتسری، شوچرن داس اختر گھنگالوی، زنبیر سنگھ امر ابد آبادی، دوارکا داس شعلہؔ، مہر لال صوفی ضیا فتح آبادی، رام پرکاش ساحر ہوشیارپوری، دیوان تیج ونت رائے ساحر منامی، بخشی سورج پرکاش دردؔ، کرپال سنگھ بیدارؔ، پریم لال شفا دہلوی، لال چند پرارتھی چاند کلوی، پنڈت رکھبیر داس ساحر سیالکوٹی، پنڈت خوشدلؔ، ظفر ادیبؔ، آر۔ ڈی۔ سیال وفا پٹیالوی، قمر جلال آبادی، کنہیا لال آزردہ دہلوی، لالہ جگن ناتھ کمالؔ کرتارپوری، بشند اس زار، امر ناتھ طپشؔ، ستیہ پرکاش سالکؔ، پنڈت روپ چند روپؔ، کیشو دت شاکیؔ، منوہر لال دلؔ، روشن لال روشن نکودری، سریش چندر رہبر بدایونی، بنارسی داس شیدا انبالوی، رشی پٹیالوی، مہتہ برہم دت ہما ہرنالوی، سردار سادھو سنگھ ہمدرد، ایشر داس کپور چرخ چنیوٹی، جگدیش مہتہ دردؔ، جگن ناتھ آزاد، سردارا رام صابرؔ ابوہری، شیو پرشاد جاوید دششٹ، ٹھاکر داس الفتؔ، پنڈت رام کرشن، کرشن موہنؔ، کاہن سنگھ جمالؔ، عادلؔ سرموری، کرم چندر سوا ملاں پوری، گنگا سرن قاصد برالوی، چندر پرکاش جوہر بجنوری، پرمانند شرما شرر جالندھری، وشوا ناتھ دردؔ، مہندر پرتاب جوشی ناشاد، ڈی۔ کمار، کرشن چندر امید، بہاری لال بہار کلوی، اندرجیت گاندھیؔ، کنور لال شرما کنول، ہردیال سنگھ گل پردیسیؔ، امیر چند بہار، اندر سروپ دت ناداںؔ، منوہر شرما ساغر پالمپوری، پی۔ این۔ نہرو، مہیش پٹیالوی، کالیداس گپتا رضاؔ، امرت لال عشرتؔ، راج نرائن رازؔ، پریم وار برٹنی، اوم پرکاش نسیم نورپوری، دلیپ سنگھ بادلؔ، مہر چند کوثرؔ، کنولؔ نورپوری، کھیم راج گپتا ساغرؔ، رام داس نادارؔ، امر سنگھ فگار بردالوی، اوم دت طالبؔ، پرتھوی راج کپور خمارؔ جالندھری، ن۔ ن۔ نجمیؔ، دھرمپال عاقلؔ، شباب للتؔ، گلزارؔ، ست پرکاش شوقؔ، دھرم پال جگر جالندھری، پورن کمار ہوشؔ، نریندر سنگھ سود مسحورؔ، پریم سنگھ عالمؔ، گوری نندن سنگھ عابد مناوری، نردوش حصاری، سریندر کمار کنولؔ، ایچ۔ ایس۔ خوشدلؔ۔۔۔ ابھے راج سنگھ شادؔ، نانک چند نازؔ، لوک چند شہیرؔ، ترلوک ناتھ اعظمؔ، روپ سنگھ پھولؔ، شیو لال موہنؔ، لچھمن داس شائقؔ، نند لال نیرنگؔ، ستیہ پال اختر رضوانی، ہربنس لال بیدلؔ، بلبیر سنگھ دوساجؔ، مہاراج نارائن دَرؔ، بلونت کمار ساگرؔ، دھرم پال گپتا وفاؔ، تاجور سامری، کیلاش چند نازؔ، برج لال جگی رعناؔ، گوبند داس خموش سرحدی، ترلوک ناتھ ازہرؔ، کرشن سروپ تھاپرؔ، گیان چند خادمؔ، شیو دیال سحابؔ، سری رام عرش صہبائی، چاند پرکاش قمرؔ، منموہن شرما موہنؔ، آزاد گورداس پوری، بلبیر راٹھیؔ، ستیہ پال جانبازؔ، رامانند بیتابؔ، مترنکودری، ٹی۔ این۔ سنہا کنولؔ، مہندر پرتاب چاندؔ، راز لائل پوری، لچھمن داس تبسمؔ، سدرشن پانی پتی، گیان چند منصورؔ، کشن دت طوفانؔ، نارائن داس رازؔ، ست پال شوقؔ، بلدیو سنگھ عاجزؔ، وید پرکاش اثرؔ، وید ورما رازؔ فیروزپوری، سکھد رشن کمار مدہوشؔ، راجکماری سرور جمال دہلوی، مہیش چندر نقشؔ، جنگ راج کنولؔ صراف، درشن لال زلفیؔ، کمل جیت شرما ساغر شفائی، مکند لال گپتا صادقؔ، ترلوک چند کوثرؔ، اوم پرکاش اگروال زارؔ، جگدیش بھارتی، پرتاب سنگھ راناؔ، مدن موہن خمارؔ، شنکر داس بندشؔ، نکودریا رام طالبؔ، ہریش چندر نازؔ، تلک راج بھاٹیہ عاجزؔ، مدن گوپال سنگلؔ، جوہر بھارتی، محترمہ کرن جھانسوی، روشن مظفر نگری، جگدیش چندر کوہلی سرشارؔ، بلجیت سنگھ مطیرؔ، پریم کمار نظرؔ، رتن موہن ناتھ زتشی خارؔ، الھڑ بیکانیری، ردی بھاردواج، ہری چند گلؔ انبالوی، مدن جیسوال، رگھبیر سنگھ ساحر سیلانوی، مان سنگھ خیالؔ، کنور سین حسرتؔ، شیو چرن لال صادق عشرتی، جگدیپ بہادر سوری رہبر جدید، کرشن مراری، اوم پرکاش غیرتؔ، شورام عادلؔ سرموری، لابھ چند کوہلی بیتابؔ، ڈاکٹر نریشؔ، نقش صحرائی، کاہن چند دھیر چاندؔ، پرکاش چند کوچھڑ شیداؔ، او۔ ایس۔ راکیشؔ، ترلوک سنگھ رندؔ، چیت رام رہبرؔ، امرناتھ آتشؔ، کنور چوہانؔ، گورداس نام سوزؔ، چنن سنگھ شادؔ، مدن لال ازلؔ، نریندر ناتھ شرما سودائیؔ، راجیش کمار اوجؔ، رشی پرکاش ناتھ پرویزؔ، امرناتھ سرشارؔ، کنول پرشاد کنولؔ

QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad.

جلد : 07 شمارہ : 10 اکتوبر 2022ء

زیرنگرانی
محمد خواجہ مجیب الدین
صدر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ایڈیٹر
شاہنواز قاسم، آئی پی ایس
ڈائریکٹر / سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ناشر و طابع

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی
چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی
حیدرآباد-001 500 (تلنگانہ)

مقام اشاعت : تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ترتیب وتزئین : محمد ارشد مبین زبیری

کمپوزنگ، ڈیزائننگ : محمد اعظم علی

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages : 124

قومی زبان کی خریداری کے لیے چیک ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام ڈائرکٹر / سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی روانہ کریں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

☆

''قومی زبان'' میں شائع شدہ مضامین میں اظہار کردہ خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

☆

Printed by Shah Nawaz Qasim and published by Shah Nawaz Qasim on behalf of Telangana State Urdu Academy Minorities Welfare Dept., Government of Telangana.
Printed at M/s. Taha Enterprises, Printing and Packaging, 11-6-833, Red Hills, Lakdi ka Pul, Hyderabad-500004, T.S..

Published at 4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad-500 001 Telangana State.
Ph: No. 040-23237810 Fax: 040-66362931
Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
website : urduacademyts.com

قرینہ

مضامین

یورپی ادبا

oOo

ہم کلامی

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی وقتاً فوقتاً اہم مواقع پر اپنے ترجمان قومی زبان کے خصوصی شمارے شائع کرتی ہے۔اسی روایت کو جاری رکھتے ہوئے اس ماہ کے شمارے کو ''اردو کے غیر مسلم ادباو شعراء'' کے نام معنون کیا گیا ہے جس میں ہمارے ملک ہندوستان ہی کے نہیں بلکہ یورپی ممالک کے غیر مسلم اردو ادباو شعراء کے کوائف اور کارناموں پر ہندوستان بھر کے دانشور نقاد ادبا' اساتذہ وشعرائے کرام' اسکالرس کے گراں قدر مضامین شائع کئے گئے ہیں۔امید ہے کہ یہ نگارشات ہمارے قارئین' عوام الناس' محبان اردو کی معلومات اور دلچسپیوں میں اضافے کا باعث ہوں گی اور اردو اسکالرس کے لئے بھی مددگار ثابت ہوں گی۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ زبان کا کسی خاص گروہ' مذہب یا کسی مخصوص فرقے سے تعلق نہیں ہوتا بلکہ ہر علاقہ کی زبان وہاں رہنے بسنے والوں کی رابطے کا ایک ذریعہ ہوتی ہے' اس کو کسی خاص طبقے سے جوڑنا صحیح نہیں ہے۔اردو زبان کے تعلق سے بھی جو غلط فہمی عام ہے کہ یہ کسی مخصوص فرقے اور مذہب کی زبان ہے' ایسا نہیں ہے بلکہ اردو زبان ہندوستان کی پیداوار ہے' یہیں پلی بڑھی ہے اور اس کی آبیاری میں جہاں مسلمانوں کا نام آتا ہے تو وہیں غیر مسلم اصحاب کا بھی اس زبان کے فروغ اور ترقی میں برابر کا حصہ ہے۔قومی زبان کے اس شمارے میں شامل مضامین میں آپ کو سیکڑوں غیر مسلم ادباو شعراء وصحافیوں کے نام اور ان کی اردو زبان وادب کی خدمات کے بارے میں معلومات حاصل ہوں گی۔اس کے علاوہ سیکڑوں غیر مسلم اردو ادباو شعراء اور اسکالرس ہیں جنہوں نے اپنی مادری زبانوں کے علاوہ اردو زبان میں مہارت حاصل کی اور دنیا بھر میں اس زبان کی چاشنی کو پھیلایا' ان میں جہاں نثر میں مایہ ناز افسانہ نگار منشی پریم چند' کرشن چندر' پنڈت رتن ناتھ سرشار' جوگیندر پال' کنہیا لال کپور' جگن ناتھ آزاد' طنز ومزاح اور کالم نگاری کی گراں مایہ شخصیت فکر تونسوی اور دیگر معروف نثر نگار ہیں تو وہیں شاعری میں ممتاز ومعروف شعراء تلوک چند محروم' پنڈت دیا شنکر نسیم' فراق گورکھپوری' دکن کے عظیم شعراء مہاراجہ کشن پرشاد شاد' پنڈت دامودھر ذکی' راجہ نرسنگ راج عالی' بچھی نارائن شفیق' پنڈت رگھویندر راؤ جذب عالم پوری' اسی طرح عظیم صحافی اور ادیب منشی نول کشور جن کے نول کشور پریس سے سیکڑوں اہم دستاویزات فقہ کی کتابیں' قرآن مجید' قرآن مجید کے مختلف تراجم اور تفاسیر' فتاویٰ عالمگیری کا اردو ترجمہ بنام فتاویٰ ہندیہ' تاریخی کتابوں میں تاریخ فرشتہ' آثار الصنادید 'اکبر نامہ' آئین اکبری جیسی اہم کتابوں کی طباعت کی جاتی تھی' اسی طرح موجودہ دور کے اردو اسکالرس واساتذہ میں گوپی چند نارنگ' گیان چند جین اور ایسے ہی کئی غیر مسلم اساتذہ وادیب جو ہندوستان سے نہیں بلکہ یورپی ممالک سے تعلق رکھتے ہیں جن میں' گارسین دتاسی' جان گل کرسٹ اور بھی کئی دیگر غیر مسلم اردو اسکالرس شامل ہیں جن کے کارنامے آپ اس شمارے میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔بلاشبہ اردو زبان اپنی سادگی' لطافت اور ہمہ رنگی کی وجہ سے سارے عالم میں پھیلی اور اس کی چاشنی نے سب کو متاثر کیا۔آج بھی ہندوستان کی ممتاز جامعات جامعہ عثمانیہ' مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی' جامعہ ملیہ' کشمیر یونیورسٹی' سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد' دہلی یونیورسٹی' بی آر امبیڈکر یونیورسٹی میں کئی غیر مسلم طلباء اردو میں پی ایچ۔ڈی کر رہے ہیں جس سے اردو زبان کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی مادری زبان کی اہمیت کو سمجھیں اور اس زبان کی ترقی وترویج کے لئے آگے آئیں اور خود بھی اردو سیکھیں اور اپنے بچوں کو بھی اس زبان کی طرف راغب کریں۔

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی فروغ اردو کی اپنی اسکیمات کی عمل آوری کی کوشش میں مصروف ہے۔اکیڈیمی کی معلنہ اسکیمات میں چھوٹے اردو اخبارات اور اردو الیکٹرانک میڈیا کے نمائندوں کو سال 22-2021 کی سالانہ مالی اعانت' سال 2019 اور 2020 کی اردو کی مطبوعہ کتابوں پر انعامات اور اردو مصنفین کی سال 2020 کی کتابوں کی طباعت کے لئے جزوی مالی اعانت کی عمل آوری ہو چکی ہے اور ان اسکیمات کی رقوم مذکورہ استفادہ کنندگان کے بینک اکاؤنٹس کو روانہ کر دی گئی ہیں۔باقی معلنہ اسکیمات کی عمل آوری کا کام جاری ہے' امید ہے کہ جلد ان تمام اسکیمات کی تکمیل ہو جائے گی۔بہرحال تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی اپنے ادبی اور علمی سفر کو اور تیز کرے گی۔فروغ اردو کے سلسلہ میں آپ تمام کی آراء ہمارے لئے قابل قدر ہیں' اپنے مفید مشوروں سے ہماری ہمت افزائی فرمائیں۔

شاہ نواز قاسم' آئی پی ایس
ایڈیٹر

اپنی بات

دنیا میں جتنی بھی زبانیں ہیں وہ سب اپنے اپنے علاقے میں انسانوں کے آپس میں رابطے اور تعلقات کو استوار کرنے کا کردار ادا کرتی ہیں' ان زبانوں کا نہ تو کسی مذہب سے اور نہ کسی فرقہ سے اور نہ ہی کسی خاص علاقہ سے تعلق ہوتا ہے' جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے یہ زبان کئی زبانوں کے سنگم سے بنی ہے' اسے لشکری زبان بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں جہاں عربی' فارسی اور ہندی کے سیکڑوں الفاظ ہیں تو وہیں اس زبان میں پنجابی' سندھی سنسکرت' سرائیکی' بھوجپوری' مراٹھی گجراتی' تلگو' کنڑ کے علاوہ انگریزی' پرتگیزی اور یورپی الفاظ بھی شامل ہیں' اس طرح اردو کی پیداوار کئی زبانوں کے میل سے ہوئی' اور اس زبان کو ہندو مسلم سکھ عیسائی اور دیگر اقوام سب ہی نے اپنایا۔ اس کی وجہ اس زبان کی چاشنی اور لطافت ہے۔ نثر یا نظم دونوں ہی زمروں میں اس زبان وادب کے جہاں مسلمان ادیب وشاعر آپ کو ملیں گے تو وہیں سیکڑوں غیر مسلم شعراء وادیب نے بھی اس زبان میں اپنا نام کمایا ہے۔ جیسا کہ ابتداء میں بتایا گیا کہ کسی زبان کا کسی خاص مذہب یا فرقہ یا علاقہ سے تعلق نہیں ہوتا' بلکہ زبانوں کو صرف اور صرف رابطہ اور تعلیم وتعلم کے لئے یا ادبی تعلق کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی نے اردو زبان سے سماج' ہر مذہب اور ہر علاقہ کے افراد کے درمیان ربط' محبت اور تعلق کو عوام کے سامنے لانے اور اس گنگا جمنی زبان کے کسی خاص فرقے سے تعلق کی نفی کرنے اور اس تعلق سے پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنے اپنے ترجمان ماہنامہ قومی زبان کے ماہ اکتوبر 2022ء کا خصوصی شمارہ ''اردو کے غیر مسلم ادباء وشعراء'' کے عنوان سے شائع کر رہی ہے جس میں ہندوستان اور بیرون ہندوستان اردو کے غیر مسلم ادیبوں اور شعراء کے کارناموں اور اردو کے لئے ان کی خدمات کو عوام کے سامنے لانے' اساتذہ' ادیب' شعراء واسکالرس کے مضامین شائع کئے گئے ہیں۔ یہ اردو اکیڈیمی کا ایک مستحسن اقدام ہے' مجھے امید ہے کہ ان مضامین کے ذریعہ عوام الناس میں پھیلی غلط فہمیاں دور ہوں گی اور اس کے ساتھ ساتھ یہ معلومات ہمارے اردو ریسرچ اسکالرس کے لئے بھی معاون ثابت ہوں گی۔

جیسا کہ آپ کے علم میں ہے ہمارے عزت مآب وزیر اعلیٰ جناب کے۔ چندرا شیکھر راؤ اقلیتوں اور پچھڑے طبقات کی سماجی و علمی ترقی کے ساتھ ساتھ ان کی زبان کی ترقی کے سلسلہ میں بھی کافی سنجیدہ ہیں' اس ضمن میں انہوں نے ساری ریاست میں اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا ہے اور اس کی عمل آوری کے لئے سرکاری دفاتر میں جہاں اردو آفیسرس کا تقرر کیا ہے وہیں تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کے ذریعہ بھی فروغ اردو کی کئی اسکیمات کو جاری رکھا ہے' اردو اکیڈیمی کے ذریعہ حکومت کی جاری اسکیمات کی عمل آوری کے ضمن میں اردو مصنفین کی سال 2019 اور 2020 کی منتخب طبع شدہ کتابوں پر انعامات' اردو مصنفین کی سال 2020 کی کتابوں کی اشاعت کے لئے جزوی مالی اعانت' اردو کے چھوٹے اخبارات اور اردو الیکٹرانک میڈیا کے نمائندوں کو سال 22-2021 کی سالانہ مالی اعانت کی منظوری دی گئی اور ان تمام اسکیمات کی رقم منتخب افراد کے بینک اکاؤنٹس کو روانہ کردی گئی ہے ۔ اسی طرح ماباقی معلنہ اسکیمات کی جلد عمل آوری کی کوشش جاری ہے اور امید ہے کہ بہت جلد ان اسکیمات کی بھی تکمیل کردی جائے گی۔ بہر حال ہماری کوشش رہے گی اردو اکیڈیمی کی تمام اسکیمات کی اپنے اپنے وقت پر عمل آوری ہو۔ اس کے علاوہ ماہرین اردو' اساتذہ اور محبان اردو کے مشوروں سے فروغ اردو کے سلسلہ میں مزید نئے پروگرامس بھی طے کئے جائیں گے۔

محمد خواجہ مجیب الدین
صدر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

اردو نظم نگاری کے روشن مینار۔تلوک چند محروم

پروفیسر مجید بیدار

موضوعاتی نظم کے آغاز کے دوران مولانا حالیؔ جیسے نظم نگار اور محمد حسین آزاد جیسے نیچرل شاعر کے بعد چکبست لکھنوی اور دُرگا سہائے سرور جہاں آبادی جیسے اہم شاعروں نے نظم نگاری کی جوت جلائے رکھی اور اردو کی شعری روایت کو موضوعاتی معاملات سے وابستہ کرتے ہوئے بے مثل کارنامے انجام دیئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلم شاعروں کی باوقار نسل نمودار ہوئی' جنھوں نے شاعری کے نئے انداز کے ذریعہ نہ صرف نظمیں' غزلیں' رباعیات اور بچوں کی نظمیں لکھیں' بلکہ وطنی شاعری اور حمد ونعت اور مناجات کے علاوہ غزل گوئی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے پابند شاعری کی روایت کے وقار کو برقرار رکھا۔ اردو کے ایسے نامور شعراء میں تلوک چند محروم کا شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے رُباعی کی شاعری کو بھی اظہار کا وسیلہ بنایا۔ چنانچہ وہ سادہ' رواں اور قابلِ توجہ اظہار کے ذریعہ نظم کے توسط سے شعری ضرورت کی تکمیل اور نغمگی کو فروغ دینے کا فریضہ انجام دے چکے ہیں۔ بلاشبہ تلوک چند محروم کی نظم ہو کہ غزل' رباعی ہو کہ بچوں کی نظم' غرض ہر اظہار میں سادگی اور بے ساختگی کے علاوہ نغمگی کا عنصر رواں دواں نظر آتا ہے۔ وہ اپنے شخصی مرثیوں کے ذریعہ بھی دل کی عمیق گہرائیوں سے اظہارِ عقیدت کرتے ہیں اور گزرنے والے صدمات کو جذبات اور احساسات کی روانی میں حددرجہ نمایاں کررہے ہیں۔ جس کی وجہ سے اظہار کی ندرت اور فکر کی صلابت واضح ہوجاتی ہے۔ اسی لئے نظم گو شعراء کے قافلہ میں تلوک چند محروم اور ان کے شعری ورثہ کو امتیاز کا مقام حاصل ہوجاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اردو زبان وادب کی ترقی وترویج میں حصہ لیتے ہوئے نہ صرف فطری اظہار کے ذریعہ شعر گوئی کی عمارت کو مستحکم کیا' بلکہ اپنے صاحبزادے جگن ناتھ آزاد کو بھی اردو زبان و ادب کے بہی خواہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ اردو شاعری اور ادب کی تاریخ میں شعری روایت کو نئی نسلوں تک پہنچانے کی خدمت انجام دینے کے سلسلہ میں تلوک چند محروم کی سرگرمیوں کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ وہ نہ صرف حساس مزاج اور شعری روش کی گہرائی سے مضبوط علاقہ رکھتے تھے' بلکہ شاعری کے مزاج اور اردو ادب کی اخلاقی اور شعری حسیت سے بھی افکار کو آراستہ کرتے تھے' اس لئے اردو شعر و ادب میں ان کے مقام ومرتبہ کو اردو کے دوسرے بہی خواہوں کے کارناموں سے زیادہ اہمیت کا مقام حاصل ہوجاتا ہے۔

اردو نظم کے نئے رجحانات کو فروغ دینے والے شاعروں میں مولانا حالی' محمد حسین آزاد اور اسماعیل میرٹھی کے بعد تلوک چند محروم کا نام حددرجہ اعزاز کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ وہ دریائے سندھ کے کنارے آباد مشہور مقام میانوامی کے ضلع گوجرانوالا میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ پیدائش یکم جولائی 1887ء درج کی گئی ہے۔ جب ان کا گاؤں دریابرد ہوگیا تو ان کا خاندان مشہور علاقہ عیسیٰ خیل منتقل ہوگیا۔ یہیں پر تلوک چند محروم کا بچپن گزرا۔ دیہاتی مسلمان بچوں کے ساتھ کھیل کود اور باقاعدہ تعلیم کے ذریعہ محروم نے ورنا کولر فائنل میڈل اسکول میں داخلہ لیا اور ہائی اسکول تک ہر جماعت میں سب سے آگے رہے۔ پانچویں جماعت سے لے کر آٹھویں جماعت تک اچھے نشانات حاصل کرنے کے علاوہ ذہین اور ہونہار طالبِ علم ہونے کی وجہ سے سرکاری وظیفہ کے حقدار قرار دیئے گئے۔ چونکہ اس علاقہ میں کوئی ہائی اسکول نہیں تھا' اس لئے 70 میل دور علاقہ میں موجود ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ چنانچہ محروم نے

مضامین

وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان 1907ء میں پاس کیا۔ جس کے بعد وہ لاہور چلے آئے اور سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں تدریس کی منزلیں طے کیں۔ غرض انہوں نے ملازمت کے دوران ہی ایف اے اور بی اے کا امتحان کامیاب کیا۔ علاقہ عیسیٰ خیل میں ملازمت سے وابستہ ہوگئے۔ مفتی احمد سعید انسپکٹر آف اسکول کی مدد سے کلورکوٹ مڈل اسکول میں تبادلہ کروالیا اور تدریس کی خدمات انجام دینے لگے جن پر انگریزی حکومت کی نظریں مرکوز ہوئیں۔ تحقیقات کا سلسلہ شروع ہوا۔ جب معاملہ رفع دفع ہوگیا تو انہوں نے راول پنڈی تبادلہ کروالیا اور چھاونی بورڈ اسکول میں صدر مدرس مقرر کئے گئے۔ ملازمت کے تین سال گزرنے کے بعد 1947ء میں ملک کی تقسیم عمل میں آئی۔ شہروں اور بازاروں میں ہنگامے برپا ہوگئے۔ جس سے متاثر ہوکر تلوک چند محروم نے جالندھر کا سفر کیا اور بڑی مشکل سے اپنے صاحبزادے جگن ناتھ آزاد کے پاس دہلی پہنچ گئے۔ اس دور میں روزنامہ ''تیج'' کے مدیر لالہ تیج بندھو نے ان کی ملازمت کا انتظام کردیا اور وہ پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج نئی دہلی میں لکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے۔ مارچ 1962ء میں ان کی علمی و ادبی خدمات کے صلہ میں حکومتِ پنجاب نے انہیں کیڈز خلعت اور سپاس نامہ پیش کیا۔ محروم کی صحت خراب ہوچکی تھی۔ 1962ء سے 1965ء تک وہ ولنڈن نرسنگ ہوم میں زیر علاج رہے۔ چنانچہ 6 جنوری 1966ء کو خالقِ حقیقی سے جاملے۔ انتقال سے دو دن قبل انہوں نے جو شعر لکھا تھا' وہ خود ان کی زندگی کی بھرپور عکاسی کرنے کے لئے کافی ہے۔

محروم آج عالمِ فانی سے چل بسا
مانگو دُعا یہی کہ خدا مغفرت کرے

تلوک چند محروم کی تصانیف میں موجود ادبی ذخیرہ بلاشبہ ان کی شاعری سے مربوط ہے۔ چنانچہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''گنج معانی'' شائع ہوا۔ اپنی رباعیات کا مجموعہ ''رباعیاتِ محروم'' کے نام سے پیش کیا۔ وطن سے محبت اور وطن دوستی کی نمائندگی کرنے والی شاعری کو ''کاروانِ وطن'' کے نام سے شائع کیا۔ بچوں سے محبت اور بچپن کی زندگی کے کارناموں کو شعری مجموعہ ''بہارِ تفلی'' میں پیش کیا۔ ان کی دوسری تصانیف میں ''شعلہ نوا'' اور ''نیرنگِ معانی'' کے علاوہ ''بچوں کی دنیا'' جیسے شعری مجموعے شامل ہیں۔ انہیں اردو شاعری میں نظم نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے۔ خیالات کے نئے پیکروں کی تخلیق کرنے اور دل کے گداز کو احساس کی نرمی کے ساتھ پیش کرنے کا فطری رجحان ان کی شاعری کا امتیازی وصف ہے۔ ترسیل کا نکھار اور جذبہ کی اثر آفرینی ان کے شعری امتزاج کی خوبی ہے۔ نظم ہو کہ غزل' رباعیات ہوں کہ بچوں کا ادب' وہ اپنے اظہار کے ذریعہ ادبی ماحول تیار کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق کی نشوونما کے لئے ماحول تیار دیئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نیچرل شاعری سے متاثر کرتے اور شعری رویہ کے ذریعہ نظم یا غزل کو نغمہ میں سمونے کی صلاحیت کا شعور بھی رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد اور مولانا حالی کے علاوہ اسماعیل میرٹھی اور چکبست لکھنوی کے بعد سرور جہاں آبادی کے بعد شعری روش کو آوازوں کی ہم آہنگی سے خوبصورت بنانے کے مرحلہ میں تلوک چند محروم کے شعری آہنگ بڑی اہمیت حامل ہے۔ انہیں فطرت کے دلفریب جلوؤں اور حسین و رنگین مناظر کی پیشکشی کا فنی شعور حاصل ہے۔ ان کی نظموں میں دریاؤں کا ترنم ہی نہیں' بلکہ موجوں کا تقدس اور پرندوں کی چہچہاہٹ کے ساتھ ساتھ کھیتوں کی خشک ہواؤں اور پھولوں کی خوشبو بکھیرنے والی عطر بیز خوبی کی نشاندہی کا وصف وجود ہے۔ انہوں نے دو مشہور نظموں ''آفتابِ عالم تاب'' اور ''آندھی'' میں منظر نگاری کو پیکر کا رقعہ دے کر

مضامین

شاعری کو مرقع نگاری کا نمونہ بنادیا ہے۔ ان کی دیگر نظموں میں جمالیاتی احساس پوری طرح جلوہ گر ہے۔ شاعری میں تخلیقی خصوصیت کو شامل کر کے جن نظموں میں انہوں نے جمالیاتی احساس اور پیکر تراشی کے نمونے پیش کئے ہیں' ان نظموں میں بطورِ خاص ''وقتِ سحر''، ''ماہِ کامل''، ''آفتاب''، ''دھوپ''، ''کوہِ مری'' اور ''خفتگانِ خاک'' کو اہمیت کا درجہ حاصل ہے۔ ان نظموں کے ذریعہ منظرکشی کی کیفیت کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ تلوک چند محروم نے اخلاقی تصورات اور دلی جذبات کی نمائندگی کا حق ادا کرتے ہوئے خیال پر جذبہ کے غلبہ کو پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کی مشہور نظموں میں ''ماہتاب''، ''انجامِ گل''، ''اترا ہوا دریا''، ''وادیٔ غم'' ''سبزۂ نو''، ''فریاد'' اور ''کولھو کا بیل'' کی فکر اور فطری خصوصیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ فطرت نگاری کے سلسلہ میں ان کی نظمیں ''مچھلی کی بے تابی'' اور ''چڑیا کی زاری'' کے علاوہ ''بیل کی فریاد'' سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خدا کی مخلوقات کو مضبوط بندھنوں میں جکڑ کر جاندار کو حالات اور حوادث کے ہاتھ میں کھلونا بنانا بھی درحقیقت ایک جرم کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کی شاعری میں دردمندی اور شکستگی کا احساس بھی موجود ہے۔ چنانچہ ''خیالِ مرگ'' اور ''موت کا خطرہ'' ان کی ایسی نظمیں ہیں' جن میں دردمندی کا احساس شدید ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

مارا کسی غریب کو تو نے وطن سے دور
ماں باپ سے بہت پرے بھائی بہن سے دور
لاشہ کوئی پڑا ہے مزار و کفن سے دور
دستِ صدائے شیون و شورِ محن سے دور
پھولوں کی آہ ناز بھری انجمن سے دور
گھونٹا گلا ہزار کا صحنِ چمن سے دور

تلوک چند محروم کا طرزِ اخلاق حد درجہ پر اثر اور پرزور ہونے کے علاوہ اثر انگیز بھی ہے۔ انہوں نے اپنے دور کی اہم شخصیتوں کے گزر جانے پر شخصی مرثیے بھی لکھے' جن میں حد درجہ کہرام اور اندوہناک رویہ کی نمائندگی کے ساتھ ساتھ ان سے عقیدت مندی کا پرجوش سیلاب بھی اُمڈ پڑتا ہے جن میں المیہ عناصر بھی جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ سرور جہاں آبادی' برج نارائن چکبست' نادر کاکوروی' رابندرا ناتھ ٹیگو اور دیا نرائن نگم کی رحلت پر ان کی لکھی ہوئی نظموں سے نہ صرف انسانی نفسیات کی تہوں کا پتہ چلتا ہے' بلکہ انہوں نے بن باس کے موقع پر سیتا جی کا پتہ نہ ملنے پر بے قراری اور اضطراب کی کیفیت کو رام چندر جی کے جذبات سے ہم آہنگ کر کے بڑے ہی فنکارانہ انداز میں بصیرت کا سہارا لیا ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

اشجار مجھے اس کا پتہ کیوں نہیں دیتے
پتوں کی زباں ہے تو صدا کیوں نہیں دیتے
مرغانِ ہوا تم ہی بتا کیوں نہیں دیتے
سیتا پہ جو گزری ہے سنا کیوں نہیں دیتے
بھرتا نہیں دم کوئی بھی فریاد رسی کا
سچ ہے کہ نہیں کوئی مصیبت میں کسی کا

نظم کی شاعری کے توسط سے تلوک چند محروم کے فکر و انداز کی بھرپور نمائندگی ظاہر ہوتی ہے۔ ''افکارِ محروم'' کے ذریعہ ان کی قومی شاعری اور وطنی شاعری ہی نہیں' بلکہ رباعی گوئی کی خصوصیات کو بھی بہترین اظہار کا وصف ہے۔ اس کے علاوہ غزل کے ذریعہ بھی اپنی فکر و احساس کی نازکی کو ظاہر کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ پروفیسر اعجاز حسین نے تلوک چند محروم کی غزل گوئی کو اس حقیقت سے قبول کیا ہے کہ وہ جدید و قدیم

کے دورا ہے پر کھڑی نظر آتی ہے۔ چنانچہ ان کے تغزل میں ان دونوں رجحانات کی پذیرائی شامل ہوجاتی ہے۔ گوپی چند نارنگ نے محروم کی قومی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ قومی شاعری کی درخشاں اور تاجور تصنیف کی خوبی تلوک چند محروم کی شاعری میں موجود ہے۔ جس میں جدوجہدِ آزادی اور آزادی پسند سورماؤں کے کارناموں کا منظر عام پر لایا گیا ہے۔ ان کی رباعیات کے موضوعات بھی ہمہ گیر ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ رباعیات کے ذریعہ حمد ومناجات اور جذبات اور احساسات ہی نہیں، بلکہ فکر ونظر اور واقعات وتقریبات کی نیرنگ سرخیوں سے آراستہ کر کے رباعیات کی شاعری کو دوآتشہ بنانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ غزل میں جہاں لطیف جذبات کی عکاسی ہوتی ہے، وہیں حیات وکائنات کے رموز کو بھی وہ اپنی علامتوں کے توسط سے ادا کرنے میں اور انسان کے دل کی دھڑکن کو تجربہ کی کسک سے احساس کی قربت عطا کرنے کا حق ادا کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں نظم، غزل اور رُباعی کے اوصاف ہی موجود نہیں ہیں۔ بلکہ وہ اظہار وابلاغ کی توانائی کے علاوہ بیان کی پختگی اور حسی پیکروں کی خصوصیت کی آئینہ گری کرتے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری کے ذریعہ ہمہ رنگی اور ہمہ موضوعات کو پیش کرنے میں تلوک چند محروم کو بڑا کمال حاصل ہے۔ انہوں نے اپنے انٹرویو میں خود بتایا ہے کہ ان کی مادری زبان اردو نہیں، بلکہ ملتانی ہے۔ لیکن اردو زبان میں جذبات واحساسات کو پیش کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں نہیں ہے۔ کم عمر بچوں کے لئے محروم نے جو نظمیں لکھیں، ان کا اخلاقی پہلو اور افادی رویہ اپنی جگہ مسلمہ ہے۔ انہوں نے شاعری کے لئے مختلف ہیتوں کا استعمال کیا۔ لیکن مسدس اور تجسس کی ہیئت کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ مدارس کے نصاب میں شامل محرؔوم کی ایک مشہور نظم ''محنت'' سے چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں:

محنت بغیر ممکن جینا نہیں جہاں میں
محنت سے وہ بنا ہے رہتے ہو جس مکاں میں
محنت کا پھل ہیں پودے جتنے ہیں گلستان میں
محنت لگی ہوتی ہے بلبل کے آشیاں میں
محنت کرو عزیزو محنت سے کام ہوگا

تلوک چند محروم کی خوبی یہی رہی ہے کہ انہیں بچوں اور بڑوں ہی نہیں، بلکہ ہر مزاج کے انسانوں کی توجہ کے موضوعات سے بڑی دلچسپی رہی ہے۔ یہی وجہ رہی ہے کہ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ ادبِ اطفال اور ادبِ نوجوان ہی نہیں، بلکہ ہر قسم کے فکر وخیال کو شاعری کے ذریعہ پوری احتیاط اور توجہ کے ساتھ پیش کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ یہی کمال تلوک چند محروم کو اردو شاعری میں نظم کے توسط سے اہم کارنامہ انجام دینے کا تخلیق کار قرار دیتا ہے اور ان کے ادبی مقام کو بلند کرنے کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔ غرض تلوک چند محروم نے سادہ اور رواں زبان میں نظمیں لکھ کر اپنے افکار کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ جس کے نتیجہ میں اردو نظم نگاری کی تاریخ کے روشن میناروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

☆☆☆

پروفیسر مجید بیدار
سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ
موبائل:9441697072

دکن کے تین اُردو رتن مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ لکشمی دیوی راج اور ڈاکٹر شیلا راج

مہاراجہ سر کشن پرشاد شادؔ: سلطنت آصفیہ میں اردو کی سرپرستی سلاطین آصفیہ کے ساتھ ساتھ یہاں کے وزرائے اعظم نے بھی کی۔ بلکہ اس خصوص میں ان کی خدمات سلاطین سے زیادہ گراں قدر رہیں۔ ارسطو جاہ، مہاراجہ چندولال، نواب فخرالدین خاں اور مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ نے اس زبان کے ادبی اور علمی سرمایے کو بڑھانے میں اپنی قلمی کاوشوں کے علاوہ اپنی داد و دہش سے جو خدمات انجام دی ہیں یقیناً اس قابل ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کی خدمات کا فرداً فرداً جائزہ لیا جائے۔ یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ ایک طویل عرصے تک سلطنت آصفیہ میں وزیر اعظم رہے۔ غفران مکاں نواب میر محبوب علی خاں کے زمانے میں پیشکاری کے عہدہ پر فائز رہے۔ ان کے انتقال کے کچھ عرصے بعد مجلس وزرا کی صدارت سے سرفراز کیے گئے۔ ان کے دربار میں اہل کمال کا مجمع رہتا تھا۔ اہل کمال میں ہر فن کے باکمال اُن کے خفیہ اور علانیہ داد و دہش سے فیض یاب ہوتے تھے۔ کسی نوجوان ادیب اور شاعر میں غیر معمولی صلاحیت دیکھ کر خود اپنی طرف سے پہل کر کے اس کے پاس تحائف بھیجتے، بلاتے اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔ اردو کے تمام مشہور شاعروں ادیبوں سے اُن کی مراسلت تھی۔ یہاں تک کہ اقبالؔ جیسا خود دار شاعر بھی مہاراجہ شادؔ کے اعلیٰ اخلاق ادبی ذوق اور خلوص کا گرویدہ تھا۔ چناں چہ دونوں کے خطوط کا مجموعہ ''شاد اقبال'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ نیاز فتح پوری سے بھی مہاراجہ شادؔ کے اچھے مراسم تھے۔ دونوں کی آپس میں خط و کتابت ہوتی۔ ان کے خطوط کے مجموعے کو راقم الحروف نے شاد و نیاز کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔

مہاراجہ کشن شاد نے نظم و نثر کی تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ نثر میں مختلف نوعیت کے مضامین، ناول اور سفرنامے ہیں جو شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کا تعلق اس دور سے تھا جب کہ فنی اعتبار سے نثری اصناف کی ہیئت اور تعریف طے ہوئی تھی اور نہ اُن کی حدیں متعین ہوئی تھیں۔ لیکن مہاراجہ شادؔ اصناف کی قیود کو ذہن میں رکھے بغیر بے تکلفانہ اور مسلسل لکھتے رہے۔ جہاں تک نظم نگاری کا تعلق ہے مہاراجہ کے ذوق شعری کا جھکاؤ کسی خاص صنف سخن کی طرف نہیں رہا، وہ ابتدا ہی سے ہر صنف اور ہیئت میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ اس لیے جہاں انھوں نے غزل، قصیدہ اور مرثیہ جیسی قدیم اصناف میں اپنا کمال دکھانے کی کوشش کی وہیں جدید انداز کی نظمیں بھی کامیابی کے ساتھ کہی ہیں۔ ان کی مختصر مثنویاں بھی درحقیقت مسلسل نظمیں ہی ہیں۔ مہاراجہ شادؔ کی مندرجہ ذیل نظمیں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ رین بسیرا، مجموعہ مناجات، نظم دو پیہ، نعرہ، مستانہ، درس محبت اور جذبہ قومی۔

غزل گوئی میں بھی مہاراجہ نے شہرت حاصل کی۔ کئی اساتذہ سے انھوں نے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ غزلیات کے چار مجموعے باغ شادؔ، خمکدۂ شادؔ، نغمہ شاد اور بیاض شاد شائع ہو چکے ہیں۔ بیاض شادؔ ۱۹۲۵ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا تھا۔ اس طویل عرصے میں مہاراجہ کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ سال ۲۰۰۹ء میں ڈاکٹر نارائن راج نے طئے کیا کہ مہاراجہ شاد پر ایک سمینار ہو۔ اسی دوران انھوں نے اپنی لائبریری میں محفوظ مخطوطات سے مہاراجہ شادؔ کا خاصا کلام اکٹھا کیا۔ جس میں بے شمار معیاری غزلیں بھی ہیں۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے ''غزلیات شادؔ'' کے نام سے ایک کتاب مبسوط مقدمہ کے ساتھ مرتب کی ہے۔ اس طرح غزلیات کے پانچ مجموعے شائع ہوئے۔ گلدستہ شادؔ میں نظموں کے علاوہ سلام، قطعات، رباعیات، منظوم خطوط اور ٹھمریاں وغیرہ ملتی ہیں۔ اس مجموعے میں جتنے بھی سلام شامل ہیں۔ ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مہاراجہ شادؔ کو حضرت امام حسینؓ سے گہری عقیدت تھی اور وہ واقعات کربلا سے بے حد متاثر تھے۔

''زمزمہ'' کے زیر عنوان حمد لکھی ہے۔ اس میں خدائے تعالیٰ کی وحدانیت اور عظمت کا ذکر ہے۔ آمد ہی آمد ہے آورد کا پتہ نہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

تیری ذات واحد مری کبریا ہے
ترا ہی تو داتا ہمیں آسرا ہے

مضامین

مری جھولی بھر دے دعا میری سن لے

میہ منھ مانگی داتا مرادیں مجھے دے

اس مجموعہ میں شامل کئی رباعیات سے اخلاقی درس ملتا ہے۔ مہاراجہ شاؔد کے کلام کا بیشتر حصہ جس میں رباعیات قطعات وغیرہ ہیں' بڑا سبق آموز ہے۔ نیکی کی تلقین' جھوٹ' حسد وغیرہ سے دور رہنے کی ترغیب غرض کہ کئی اصلاحی پہلو نظر آتے ہیں۔ ذیل کی رباعی بھی سبق آموز ہے:

نیکی کا جو ہے کام وہ جلدی کرلو

مخلوق خدا کی دل سے امداد کرلو

بھئی گنگا ہے ہاتھ دھولو اے شاؔد

اس ہاتھ سے تم دو تو پھر اُس ہاتھ سے لو

مہاراجہ شاؔد نظم ونثر کی تقریباً تمام اصناف پر قدرت رکھتے تھے۔ ڈاکٹر نارائن راج کی اہلیہ محترمہ ڈاکٹر شیلا راج مرحومہ' اُردو زبان وادب کی شیدائی تھیں۔ بلند پایہ ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ادب دوست' ادب نواز شخصیت کی حامل تھیں۔ انھوں نے مہاراجہ کشن پرشاد کی کئی غیر مطبوعہ بیاضوں کو سنبھال کر رکھا تھا۔ اُن کا مصمم ارادہ تھا کہ اس نایاب ذخیرہ کو ضائع ہونے سے بچائیں اور کسی نہ کسی طرح کتابی شکل دیں۔

☆☆☆

لکشمی دیوی راج: لکشمی دیوی راج کی پیدائش حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں ہوئی اور یہی ان کے والدین کا وطن بھی ہے۔ وہ حیدرآبادی ہونے پر فخر کرتی ہیں۔ ان کے والد راجا بہادر ڈاکٹر بی ایس راج' پرنس اعظم جاہ بہادر اور پرنسیس درشہوار کے ڈاکٹر مقرر کئے گئے۔ لکشمی دیوی راج کی مادری زبان اردو ہے جس پر انھیں ناز ہے۔ اسکول جانے سے پہلے انھیں اردو پڑھانے کے لیے ماسٹر مقرر کئے گئے تھے۔ پڑھائی کے ساتھ انھیں خوش خطی بھی سکھائی گئی۔ اس دوران اردو زبان سے ان کا لگاؤ بڑھتا گیا اردو کتابیں اور میگزین زیر مطالعہ رہے۔ والدہ کو بھی اردو زبان وادب سے لگاؤ تھا۔ ان کے ہمراہ وہ ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں میں شرکت کرتیں۔ بیگم اختر ان کی پسندیدہ گلوکارہ ہیں۔

لکشمی دیوی راج کی ابتدائی تعلیم Rosary Convent میں ہوئی ساتویں جماعت میں انھیں وزیر تعلیم نواب مہدی یار جنگ کے ہاتھوں اردو زبان کی بہترین طالبہ کا سرٹیفکیٹ دیا گیا۔ ویمنس کالج سے انگلش لٹریچر سے بی اے کیا' بی اے کی تکمیل کے بعد وہ ملازمت کرنا چاہتی تھیں لیکن والدہ نے اجازت نہیں دی۔ اس اثنا میں ان کی ملاقات Mrs. T. dhage سے ہوئی جو ایک یتیم خانہ کی نگران کار تھیں۔ لکشمی دیوی راج اکثر وہاں جایا کرتیں اور بچوں کے ساتھ وقت گزارتیں۔ اس ادارے کے مالی حالات ٹھیک کرنے کے لیے انھوں نے کئی shows کروائے۔ اس دوران اُن کی ملاقات VST کے چیرمین کی بیوی سے ہوئی۔ لکشمی صاحبہ کے کہنے پر وہ بھی اس ادارے میں دلچسپی لینے لگیں۔ Sponsorship Shows VST کرتی۔ انھوں نے بڑے فن کاروں جیسے بسم اللہ خان' ولایت خاں' پنڈت روی شنکر کو مدعو کیا۔ ان فن کاروں کی شرکت سے ادارے کی مالی حالت بہتر ہوتی رہی۔ ہندوستانی کلاسکی موسیقی سے لکشمن دیوی راج کا لگاؤ بڑھتا گیا۔ انھوں نے سرمنڈل کی ممبر شپ لے لی اس دوران آل انڈیا ریڈیو نے انھیں ایک کمیٹی کا رکن بنایا۔ مقامی Ralent کو سننے کا موقع ملا۔ Tourism کی منسٹر مسز روڈاستری سے ان کے اچھے مراسم تھے۔ حیدرآباد اور ویزاگ کے Tourism Festival میں کلچرل پروگرام کرنے کی ذمہ داری انھیں دی گئی۔ اور انھوں نے مالنی راجو' منور علی خاں Sonal Mansingh اور راجا ریڈی جیسے عظیم فن کاروں کو پیش کیا۔ لکشمی دیوی راج کا پہلا تقرر Toursim Corporation پر ہوا۔ اُس وقت جناب انور سوداگر چیر مین تھے۔

جناب رحمت علی خاں کے دورصدارت میں انھیں اردو اکیڈیمی کی رکنیت دی گئی۔لکشمی دیوی راج اردو زبان وادب کو فروغ دینے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتی ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ مصنفین کی کتابیں شائع تو ہورہی ہیں لیکن قاری نہیں ہیں'اس مقصد کے لیےنئی نسل کواردو زبان وادب سے واقف کروانا بےحدضروری ہے۔ والدین کی ذمہ داری ہے کہ بچوں کواردو زبان کی تعلیم سے غافل نہ رکھیں۔اردو زبان میں اُن سے گفتگو کریں تاکہ انگریزی کے ساتھ بچےاردو سے بھی واقفیت حاصل کریں۔

لکشمی دیوی راج حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کی علم بردار ہیں۔ان کی شائستگی اورانداز گفتگو سے ہرکوئی متاثر ہوتا ہے۔اردو زبان وادب سے گہرے لگاؤ کی اس سے عمدہ مثال اورکیا ہوسکتی ہے کہ وہ ایک بہترین نثرنگار ہیں۔۔ ناول کے علاوہ انھوں نے کہانیاں' افسانے'انشائیے لکھے۔اس کے علاوہ طنز ومزاح لکھنے پر بھی کامل عبور حاصل ہے ۔ان کے طنز یہ ومزاحیہ مضامین پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں فطری صلاحیت موجود ہے۔ محفل خواتین کے میگزین کے علاوہ زندہ دلان کے ترجمان ماہنامہ شگوفہ میں کئی مضامین شائع ہوچکے ہیں۔ڈرائیورمل گیا'طوفان بدتمیزی' بلائے ناگہانی' سناتم نے' کل کیا ہوگا کے علاوہ انشائیہ'موسم گرما دکن میں'اس کی اچھی مثالیں ہیں۔کہانی سنگم'مجھے جینے دو'لالا زاراورایسے کئی مضامین ہیں جن کے مطالعہ سے ان کے فطری ادبی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔امید کہ وہ اپنی نثری تخلیقات کوجلدازجلد کتابی شکل دیں گی تاکہ اردوداں طبقہ اس سے مستفید ہوسکے۔

☆☆☆

ڈاکٹرشیلا راج: ڈاکٹرشیلا راج 9رجنوری 1940ء کوحیدرآباد کے محلہ حسینی عالم میں پیدا ہوئیں'والد کا نام راج پرتھوی راج تھا۔ وہ کائستھ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔انہوں نے 1957ء میں میٹرک کا امتحان کامیاب کیا ویمنس کالج کوٹھی سے 1958ء میں پی یوسی میں کامیابی حاصل کی۔

ڈاکٹرشیلا راج نے اپنے تعلیمی سفرکو جاری رکھتے ہوئے 1963ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو سے ایم اے کیااس کے بعد انہوں نے بیچلر آف ایجوکیشن اورایم اے(تاریخ) بھی کامیاب کیا۔Ph.D کے لئے انہوں نے تاریخ کے مضمون کومنتخب کیااورشریمتی ناتھی بائی دامودھرٹھاکرسی ویمنس یونیورسٹی بمبئی میں 1977ء میں داخلہ حاصل کیا۔ جہاں ان کے مقالہ کاعنوان''ہسٹری آف دی سوشیل اکنامکس اینڈ کلچرل ڈیولپمنٹ ان حیدرآباد 1911-1869ء' تھا انہوں نے .Ph.D کی تکمیل 1981ء میں کی۔ڈاکٹرشیلا راج نے تدریسی خدمت بہ حیثیت اردو لیکچرارمحبوبیہ جونیئر کالج عابڈس پرانجام دی'17رجولائی 2008ءکوڈاکٹرشیلا راج کا انتقال ہوگیا۔ ہرسال 17رجولائی کو HEH دی نظامس ٹرسٹ حیدرآباد کی جانب سے ڈاکٹرشیلا راج میموریل لیکچر کا انعقادعمل میں لایا جارہا ہے۔ڈاکٹرشیلا راج کا تعلق ہندودھرم سے تھا۔ان کا خاندان کائستھ خاندان کہلاتا ہے جوریاست حیدرآباد(دکن) کے دربار سے وابستہ رہا ہے۔ڈاکٹرشیلا راج نے اردو زبان میں اعلیٰ اورمعیاری مضامین کوقلمبند کیا جوکہ متعدد اخبارات ورسائل میں وقفہ وقفہ سے شائع ہوتے رہے ہیں۔انہوں نے آصف جاہی دورحکومت میں سماجی' معاشی'تہذیبی اورعام انتظامات کے بارے میں قابل قدرتحقیق کی ہے جن کی جھلک آپ کے لکھے ہوئے 30 سے زائد مقالوں میں ملتی ہے جوادبی رسالوں اوراردوو انگریزی اخبارات میں شائع ہوچکے ہیں۔

ڈاکٹرشیلا راج کا پہلا مضمون مرزا غالب کے عنوان سے 17رجولائی 1966ء کوروزنامہ سیاست حیدرآباد میں شائع ہوا۔ڈاکٹرشیلا راج کے مضامین تحقیقی انداز لیے ہوئے ہیں' وہ اپنے مضامین کوتحقیقی حوالوں کے ساتھ پیش کرتیں اور ہرمضمون کے اختتام پرحوالوں کی ایک لمبی فہرست منسلک رہتی۔

ان کے مجموعہ ہائے مضامین کے عنوانات پرہی غورکرنے سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹرشیلا راج نہ صرف اردو زبان وادب پرقدرت رکھتی ہیں بلکہ تاریخ اورقومی یکجہتی' بھائی چارگی اوررواداری پران کی گہری نظر ہے۔اس کے علاوہ حیدرآبادی تہذیب وتمدن اورآصف جاہی عہد کے متعلق بھی ان کی متعدد تحریریں شائع ہوچکی ہیں۔انہوں نے آصف جاہی حکمرانوں اوران کی رواداری پرمضامین لکھے ہیں جن کے مطالعہ سے ہمیں ان کی اس عنوان سے متعلق دلچسپی اورتحقیقی کام کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

پروفیسرحبیب ضیاء' سابق صدرشعبہ اردو'یونیورسٹی کالج فارویمن'عثمانیہ یونیورسٹی'حیدرآباد۔فون: 9959061198

مضامین

پروفیسر سید فضل اللہ مکرم
صدر شعبۂ اردو سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد

پروفیسر گیان چند جین: سچا محقق، کھرا نقاد اور ایک معصوم استاد

اردو زبان وادب کے فروغ میں بلالحاظ مذہب وملت بے شمار افراد نے دامے درمے سخنے خدمت کی ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اردو زبان وادب کو سجانے' سنوارنے اور نکھارنے میں ''چند'' دانشوروں کا بھی ہاتھ ہے جن میں ایک پروفیسر گیان چند جین ہیں۔ وہ ایک محقق، نقاد، ماہر لسانیات، ادبی مؤرخ، شاعر اور بہترین استاد ہیں اور انھوں نے ہر سطح پر خلوص دل سے کام کیا ہے۔ کبھی نام ونمود اور شہرت کے لیے خود کو پیش نہیں کیا۔ وہ شعبۂ اردو، یونی ورسٹی آف حیدرآباد میں تقریباً دس سال تک استاد رہے اور اردو طلبا کی ذہنی آبیاری کرتے رہے۔ راقم کو اس بات پر بھی فخر حاصل ہے کہ ایم۔اے اور ایم۔فل میں ان کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔

''گیان چند'' کے معنی علم و دانش کا جامہ ہے۔ ان کی پیدائش قصبہ سیوہارا ضلع بجنور، اتر پردیش میں 19/ستمبر 1923 کو ہوئی۔ ان کے والد بحال سنگھ اور والدہ پرواتی تھا۔ ذات سے بنیا اور جین مت کے پیروکار تھے لیکن کبھی بھی مذہب کے معاملے میں انتہا پسندی سے کام نہیں لیا۔ آپ کے بڑے بھائی ڈاکٹر پرکاش مونس ہیں، جنھوں نے اردو ادب پر ہندی ادب کے اثرات کے موضوع پر اردو سے پی ایچ۔ڈی کیا مگر پیشہ سے وکیل تھے۔ گیان چند کی شادی ارمیلا جین سے ہوئی جو ہندی میں ایم۔اے تھیں۔ ان کے یہاں تین اولادیں ہوئیں۔ بیٹی منشا جندل اور بیٹوں میں اشوم جین اور منوج جین ہیں۔

گیان چند کی ابتدائی تعلیم و تربیت ان کے والد کی نگرانی میں ہوئی جنھیں اردو زبان وادب سے بڑا لگاؤ تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم سیوہارا گاؤں میں ہوئی جب کہ دسویں جماعت اور انٹر کالج مرادآباد سے کیا۔ بی۔اے کے لیے الہ آباد یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ جہاں ہرش رائے بچپن سے بھی تعلیم حاصل کی اور اسی یونی ورسٹی سے ایم۔اے اردو کامیاب کیا اور جون 1947 میں ڈی۔فل (پی ایچ ڈی) ڈگری کے لیے ''اردو کی نثری داستانیں'' کے موضوع پر پروفیسر سید ضامن علی کی نگرانی میں مقالہ لکھا۔ لیکن ملک کی آزادی کے شور شرابے کے بعد 1948 میں ڈی فل کی ڈگری حاصل کی۔ الہ آباد یونی ورسٹی میں ہی مستقل اور عارضی جائیداد پر تقررات ہوئے مگر آپ کا انتخاب نہیں ہوا۔ تین سال کی بے روزگاری کے بعد 1950 میں حمیدیہ کالج بھوپال کے شعبۂ اردو میں بحیثیت لیکچرر تقرر ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے آگرہ یونی ورسٹی سے سماجیات میں ایم۔اے کیا اور اسی یونی ورسٹی سے ''اردو مثنوی شمالی ہند میں'' کے موضوع پر 1960 میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ 1965 میں آپ کا جموں یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں بحیثیت پروفیسر کے تقرر ہوا اور بانی شعبۂ اردو ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ 1976 سے تقریباً ساڑھے تین سال الہ آباد یونی ورسٹی میں بحیثیت پروفیسر کام کیا پھر 1979 میں یونی ورسٹی آف حیدرآباد میں شعبۂ اردو کو قائم کرنے اور اسے فروغ دینے کا انھیں بھرپور موقع ملا۔ 1989 میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ کچھ برس لکھنؤ میں گزرے اور آخر کار 1998 کو بچوں کے پاس امریکہ منتقل ہوگئے۔ آخری دنوں میں وہ بہت علیل سے رہنے لگے۔ انھیں ایسا مرض لاحق ہوگیا تھا جو بقول ان کے اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ انھوں نے مدیر شاعر افتخار امام صدیقی

مضامین

کوایک خط میں اپنی بیماری کا حال لکھا۔

''میں ایک دماغی بیماری کا شکار ہوں جس کا نام Multiple System Atrophy ہے۔سائنس اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی اور جس کا کوئی علاج نہیں علاوہ موت، اس بیماری کی وجہ سے میرے جسم کا توازن جاتا رہا، روز روز گرتا رہتا ہوں اور چوٹیں کھاتا رہتا ہوں۔ 50 فیصد سے زیادہ مفلوج کی سی کیفیت ہے۔بے سہارا ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ گھر میں ڈاکٹر کی مدد سے اور گھر کے باہر وہیل چیئر سے چلتا ہوں۔'' (ماہنامہ شاعر،اگست 2006،ص:8)

پروفیسر گیان چند جین نے آخر کار 18/اگست ، 2007 کو اس مرض سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا حاصل کیا۔

ڈاکٹر گیان چند ایک شریف النفس، دیانت دار،ملنسار، نیک طینت، خوش مزاج، خوش پوشاک، خوش خوراک، خوش لہجہ، خوش فکر، مثبت رویہ، منکسر المزاج، ایک معصوم استاد اور انسان دوست شخصیت تھے۔ زندگی بھر خود کو پڑھنے اور پڑھانے میں مصروف رکھا۔آپ ایک سخت جان محقق تھے کبھی تن آسانی سے کام نہیں لیا۔مواد کی فراہمی کے لیے ہمیشہ بنیادی ذرائع پر اعتبار کیا۔

پروفیسر گیان چند کے یہاں حسِ مزاح خوب تھا۔وہ موقع ومحل پر بڑے دلچسپ فقرے کہا کرتے تھے۔وہ کنجوس تھے یا کنجوس ہونے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ایک دفعہ زیراکس کروانے کے لیے ایک شاگرد کو بھیجا اور ساتھ میں سفید کاغذ بھی دیا اور کہا کہ ان کاغذات پر ہی زیراکس نکالے۔دوسرے دن انھیں یاد آیا کہ یہ تو گھاٹے کا سودا ہے پھر اسی طالب علم کو بلایا اور کہا کہ ''کل میں نے اپنے کاغذات پر زیراکس نکالے تھے' اس نے پورے پیسے بھی لے لیے اور اپنا کاغذ بھی واپس نہیں کیا 'اس کے پاس سے سادہ کاغذ لیتے آنا'' طالب علم کچھ دیر تک سوچتا رہا کہ کہیں یہ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں پھر وہ زیراکس دوکان کے مالک سے سارا واقعہ سنایا۔ اس نے پروفیسر کا نام پوچھا اور چپ چاپ چار پانچ کاغذ حوالے کر دیے۔

وہ ایک سچے محقق تھے' غیر جانبدار نقاد تھے' ماہر لسانیات تھے' ایماندار ادبی مورخ تھے' شاعر و ادیب تھے اور ایک معصوم استاد تھے۔کمرہ جماعت میں اپنے طلبا سے نہایت شفقت کے ساتھ پیش آتا کرتے تھے' پڑھانے کا انداز بالکل مختلف تھا۔دھیمے لہجے میں سنبھل سنبھل کر پڑھاتے تھے۔اپنی ہی کتاب سامنے رکھتے اور پڑھاتے پڑھاتے کہہ اٹھتے کہ' ہائیں' میں نے ایسا لکھ دیا؟'' کبھی کوئی طالب علم کی کوئی بات پسند آتی تو وہ لکھ لیتے اور کہتے اگلے اڈیشن میں اس کو شامل کرلوں گا۔امتحان کے پرچوں میں نشانات دینے میں بخل سے کام لیتے تھے لیکن آخری دنوں میں دل کھول کر نشانات دینے لگے۔ان دنوں میری ایک کلاس فیلو حمیدہ بیگم کا تھوڑی سی علالت کے بعد انتقال ہوگیا تو سارے لوگ مغموم تھے۔خود جین صاحب نے انتہائی دکھ کا اظہار کیا کہ شاگردوں کے کاندھوں پر اساتذہ کو لے جایا جاتا ہے مگر خدا نے یہ دن دکھایا کہ اساتذہ کے سامنے ان کے شاگرد کی رحلت ہوئی ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ حیدرآباد کے قیام کے دوران انہوں نے کئی ایک اہم کتابیں تحریر کیں۔ابتدا میں ان کے مضامین کے مجموعے شائع ہوئے۔ان کی کچھ کتابوں میں کا تعارف پیش خدمت ہے۔

اردو کی نثری داستانیں: یہ کتاب ان کے ڈی فل (پی ایچ ڈی) کا تحقیقی مقالہ ہے۔اس کتاب کی اشاعت کے بعد ان کی بحثیت محقق کے شہرت میں کافی اضافہ ہوا۔یہ کتاب پہلی مرتبہ انجمن ترقی

اردو پاکستان نے 1954 میں شائع کی ۔ پھر اس کے کئی ایڈیشن شایع ہوئے ۔ یہ کتاب آج بھی ہندوپاک کی مختلف جامعات کے اردو نصاب میں شامل ہے۔

تحریریں (مجموعہ مضامین): ابتدائی دور میں لکھے گئے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو میں 1965 میں شائع ہوا۔

تجزیے: مکتبہ جامعہ نے 1973 میں ڈاکٹر گیان چند جین کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کو یکجا کر کے شامل کیا ہے۔ یہ مضامین مختلف کانفرنسوں کے لیے لکھے گئے اور کچھ مضامین بعض ادبی رسائل مثلاً ماہنامہ 'آج کل' کے خصوصی نمبرز کے لیے لکھے گئے۔

لسانی مطالعے: ترقی اردو بیورو، نئی دہلی نے 1973 میں یہ کتاب شائع کی ۔اس میں لسانیات سے متعلق لکھے گئے مضامین کو یکجا کیا گیا ہے۔ اردو میں لسانیات کے حوالے سے اس کتاب کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

رموز غالب: ڈاکٹر گیان چند کی تنقیدی بصیرت ان کی کتاب 'رموز غالب' سے عیاں ہوتی ہے۔ غالؔب پر لکھے ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین اس کتاب کا حصہ ہیں جسے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے 1976 میں شائع کیا۔

تفسیر غالب: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف کلچر اینڈ لینگویجیز نے اس کتاب کو شائع کیا۔ غالب صدی کے موقع پر یہ کتاب شائع نہ ہوسکی۔ مصنف کا کہنا ہے کہ غالب کا یہ کلام اردو شاعری کے ذخیرے میں سب سے زیادہ دقیق اور مغلق ہے۔ اس کے معنی تلاش کرنا ناکوں چنے چبانا ہے اور وہ بھی لوہے کے۔ یہ کتاب دراصل مرزا غالب کی منسوخ کلام کی شرح ہے۔

عام لسانیات: اس کتاب کو بھی کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ جسے ترقی اردو بیورو نے 1985 میں شائع کیا۔ اس موضوع پر ایک مکمل کتاب لکھنے کا ارادہ انھوں نے حمیدیہ کالج بھوپال میں رہنے کے دوران ہی کیا تھا۔ تقریباً انیس بیس سال بعد اس کتاب کو منظر عام پر لایا۔ اس کے باوجود وہ کہتے ہیں کہ "میں نے جو کچھ پیدا کیا وہ تالیف ہے۔ تصنیف نہیں، تحقیق نہیں"۔

شمالی ہند میں اردو مثنوی: یہ کتاب دراصل ان کا ڈی لٹ کا مقالہ ہے۔ جسے انجمن ترقی اردو ہند نے 1987 میں شائع کیا۔ جس میں گیان چند نے سات سو سال سے زائد پر مبنی شاعری خصوصاً مثنویوں کا جائزہ لیا ہے۔ تقریباً ایک ہزار سے زائد مثنویوں کا تعارف پیش کیا ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

ابتدائی کلام اقبال بہ ترتیب مہ و سال: ڈاکٹر گیان چند جین نے تحقیقی تصانیف کے علاوہ علامہ اقبال کا منسوخ کردہ ابتدائی کلام کو زمانی اعتبار کے لحاظ سے ترتیب دیا۔ یہ کتاب 1988 میں ترتیب دی گئی۔ وہ خود لکھتے ہیں:

"میں نے کلام اقبال کو دیکھ کر محسوس کیا کہ تخلیقات یکجا کر کے تاریخی ترتیب سے دی جائیں۔ نیز اختلاف نسخ پیش کیے جائیں۔"

ادبی اصناف: یہ کتاب 1989 میں شائع ہوئی۔ جین صاحب کی نگرانی میں نصرت مہدی نے ادبی اصناف کے موضوع پر پی ایچ ڈی رجسٹریشن کروایا تھا لیکن بنیادی مواد نہ ملنے کی شکایت تھی۔ اس پر خود جین صاحب نے یہ کتاب تحریر کی۔

کھوج: یہ بھی تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو 1990 میں شائع ہوا۔

اردو کا اپنا عروض: گیان چند جین ماہر عروض بھی تھے۔ اس موضوع پر لکھے گئے مضامین ہیں جو 1990 میں کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

پرکھ اور پہچان: مضامین کا مجموعہ ہے جو 1990 میں شائع ہوا۔

تحقیق کا فن: اردو حلقوں خصوصاً جامعات میں اس کتاب کو بے حد شہرت حاصل ہوئی۔ کیوں کہ اردو میں تحقیق خصوصاً جامعاتی تحقیق کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرنے والی یہ واحد کتاب ہے۔ یہ کتاب انھوں نے حیدرآباد یونی ورسٹی کے دوران ہی لکھا۔ ایم۔فل کی کلاس کے دوران اسی کتاب کے مسودے کو سامنے رکھ کر وہ پڑھایا کرتے تھے۔ اس کتاب کو تحریر کرنے کے لیے انھوں نے ایک سال Sabbatical Leave حاصل کیا اور تقریباً سوا سال میں کتاب کا پہلا مسودہ تیار کیا۔ اس اہم اور وقیع کتاب کی اشاعت اتر پردیش اردو اکادمی کے زیر اہتمام 1990 میں ہوئی۔

کچے بول: یہ ان کی شاعری کا مجموعہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنا کلام علامہ اقبال کو دکھایا تھا جس پر علامہ نے کہا تھا کہ آپ کو اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مجموعہ 1991 میں شائع ہوا۔

غالب شناس مالک رام: غالب اکیڈمی 1994 میں دیا گیا خطبہ 1996 میں اشاعت پذیر ہوا۔ جس میں مالک رام کا بحثیت غالب شناس جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ ایک کتابچہ ہے مگر غالب کے حوالے سے ایک اہم کام ہے۔

تاریخ ادب اردو 1700 تک: یہ کتاب جملہ پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ جسے ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر سیدہ جعفر کے اشتراک سے ترتیب دیا گیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے 1998 میں شائع کیا۔ کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر گیان چند کا لکھا ہوا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو نے تاریخ ادب اردو کی اشاعت کا منصوبہ بنایا تھا۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند نے چھ ابواب اور ڈاکٹر سیدہ جعفر نے چھ ابواب تحریر کیے۔

اردو کی ادبی تاریخیں: یہ ایک ضخیم کتاب ہے جس کو انجمن ترقی اردو پاکستان نے 2000 میں شائع کیا۔ جملہ انتیس ابواب میں اردو کی اہم اور کم اہم ادبی تاریخوں کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان تمام ادبی تاریخی کتابوں پر آپ نے نہ صرف معائب و محاسن پر روشنی ڈالی بلکہ اپنے طور پر تحقیق کرتے ہوئے مختلف تسامحات کو نشان زد کیا۔

اوپندر ناتھ اشک: اوپندر ناتھ اشک کے افسانوں، ناولوں، ڈراموں اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس نے 2000 میں شائع کیا۔

قاضی عبدالودود (بحثیت مرتب متن): قاضی عبدالودود کے مرتب متن کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے یہ کتاب 2000 میں شائع ہوئی۔

لسانی رشتے: لسانیات کے حوالے سے یہ کتاب 2003 میں شائع ہوئی۔

ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب:- یہ ان کی آخری تصنیف ہے جو 2006 میں منظر عام پر آئی۔ جس کے ساتھ ہی اردو دنیا میں ایک ہلچل مچ گئی۔ جس پر بحث و مباحثہ کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس کتاب کے خلاف میں کئی مضامین لکھے گئے جن میں فاضل مصنف کی مذمت کی گئی۔ اردو دنیا نے انھیں ایک سچا اور کھرا محقق قرار دیا مگر اس ایک کتاب کی بدولت ان کی ساری ادبی کمائی پر لوگوں نے پانی پھیر دیا۔ یہ کتاب دراصل ڈاکٹر گیان چند کے دل کی بھڑاس ہے۔ میرے نزدیک یہ ان کی دیانت داری تھی کہ اردو اور اہل اردو کے حوالے سے جو کچھ انھوں نے محسوس کیا وہ سب کچھ نہایت دیانت داری کے ساتھ صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا۔ کسی قسم کی منافقت سے کام نہیں لیا۔ گو کہ اس کتاب میں پیش کیے گئے ان خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ بہر حال یہ ان کی آخری تصنیف تھی۔

☆☆☆

مضامین

کرشن چندر کی علمی ادبی خدمات

کرشن چندر 26/نومبر 1914ء کو پیدا ہوئے' ابتدائی زندگی کشمیر میں بسر ہوئی' لاہور میں تعلیم پائی۔ نارمن کرسچن کالج سے انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا' لا کالج لاہور سے ایل ایل بی کیا۔ تین سال تک آل انڈیا ریڈیو سے منسلک رہے۔ 1942ء میں استعفیٰ دے کر شالیمار فلم اسٹوڈیو پونا اور بعد میں بمبئی ٹاکیز میں ملازمت اختیار کر لی۔ چند سال بعد ملازمت ترک کر دی اور ایک آزاد ادیب کی حیثیت سے زندگی گزارنے لگے۔ 8 مارچ 1977ء میں بمبئی میں انتقال ہوا۔

کرشن چندر نے 25 ناول 500 سے زائد کہانیاں اور چند انشائیے لکھے۔ وہ کوئی چالیس برس سے زائد عرصہ تک لکھتے رہے۔ ان کا شمار ہندوستان کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ دنیا کی پچاس کے قریب زبانوں میں ان کی کتابوں کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی ادبی شخصیت بڑی قد آور تھی۔ زندگی کی طرح ان کے ادب میں بھی تنوع تعاون کی کہانیوں میں ہلکی پھلکی شعریت' حسن کاری' رومان اور زندگی کا احساس ملتا ہے۔ مسلک کے اعتبار سے وہ مارکسی تھے اور ان کا مستقل موضوع سماج کے کچلے ہوئے طبقے کی مرقع کشی اور ان کی وکالت تھا۔ ترقی پسند تحریک کے وہ علمبردار تھے۔ کرشن چندر نے کہانی کو جدید خوبیوں سے آراستہ کیا اور اس کو مشرق کی زندگی کی وسعت اور مشاہدہ کی گہرائی دی۔ اپنے ناولوں افسانوں میں اشتراکی و ترقی پسند خیالات وتصورات کی عکاسی کی ہے۔ وہ سماج کے غریب طبقہ کو اونچا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں رومانیت اور شعریت کا پرتو نظر آتا ہے۔ کشمیر کے قدرتی حسن اور وہاں کی رعنائیوں نے ان کے اسلوب میں رومانیت پیدا کر دی۔ حالانکہ وہ سماجی۔ معاشرتی مسائل پر نظر رکھتے ہوئے اُن کے حل کی کوشش کرتے ہیں۔

پروفیسر بیگ احساس اپنی کتاب ''کرشن چندر شخصیت اور فن'' اشاعت 1999 صفحہ 316 میں ان کے افسانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''1955ء کے بعد جب جدید تحریک نے جنم لیا تو سب سے زیادہ مخالفت کرشن چندر ہی کو سہنی پڑی۔ جدیدیت کے دور میں زیادہ تر افسانے پلاٹ اور کردار کے بجائے محض خیال اور علامتوں کے سہارے لکھے جا رہے ہیں۔ کرشن چندر نے بھی اس قسم کے کئی تجربات کئے تھے۔ کوئی لاکھ مخالفت کرے لیکن کرشن چندر وہ افسانہ نگار ہیں جن کے ہاں موضوعات کی وسعت تھی۔ ان کی افسانہ نگاری کا کینوس وسیع تر تھا۔ ان کے افسانوں میں جدید افسانے کے سارے امکانات مل جاتے ہیں جنھیں بعد میں جدید افسانہ نگاروں نے برتا لیکن اس کا اعتراف نہیں کیا۔ انھیں جدید افسانے کا پیش رو کہا جا سکتا ہے۔ خواہ بعض نقاد اسے تسلیم کریں یا نہ کریں۔''

اُردو افسانے پر کرشن چندر کی تحریروں نے جتنا اثر

چھوڑا ہے اس میں سوائے پریم چند کے کسی اور کا نام نہیں لیا جا سکتا۔ کرشن چندر ایک پورے عہد کا نام ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں سماجی مسائل اور سسٹم کی خرابیوں کو موضع بناتے ہیں۔

ان کا پہلا افسانہ ''یرقان'' ہے جو 1936ء میں سالنامہ ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوا۔ کالج کے زمانے میں ایک بار یرقان کا شکار ہوئے اور صحت یاب ہونے کے بعد اسی عنوان سے انھوں نے پہلا افسانہ لکھا۔

مدیر ''ہمایوں'' نے ان الفاظ میں ان کی تعریف کی:

''مسٹر کرشن چندر کا شمار اردو کے موجودہ ادبا کی صف اول میں ہوسکتا ہے اس نوجوان ادیب کی نفیس زوردار زبان سیر حاصل اور رنگین تخیل اور گہرا نفسیاتی مطالعہ اس بات کا ضامن ہے کہ یہ شخص ہماری زبان کا زبردست ادیب ثابت ہوگا''۔

ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ'' طلسم خیال'' 1939 میں شائع ہوا۔

کرشن چندر کے افسانوی مجموعے:

طلسم خیال 1939' نظارے 1940' ہوائی قلعے 1940' گھونگھٹ میں گوری جلے' زندگی کے موڑ پر 1943' نئے افسانے 1943' نغمے کی موت 1945' اناداتا 1944' ہم وحشی ہیں 1947' ٹوٹے ہوئے تارے 1947' تین غنڈے 1948' اجنتا سے آگے 1948' ایک گرجا ایک خندق 1948' سمندر دور ہے 1948' شکست کے بعد 1951' نئے غلام 1953' میں انتظار کروں گا 1953' مزاحیہ افسانے 1954' ایک روپیہ ایک پھول 1955' یوکلپٹس کی ڈالی 1955' ہائیڈروجن بم کے بعد 1955' کتاب کا کفن 1956' دل کسی کا دوست نہیں 1956' کرشن چندر کے افسانے 1960' مسکرانے والیاں 1960' سپنوں کا قیدی 1964' مس نینی تال 1964' دسواں پل 1967' گلشن گلشن ڈھونڈا تجھکو 1967' آدھے گھنٹے کا خدا 1969' البھی لڑکی کالے بال 1970۔

کشمیر کی کہانیاں۔ کبوتر کے خط۔ کسان اور دیوتا اور کالا سورج کے افسانے دیگر افسانوی مجموعہ میں شامل کئے ہیں۔

کرشن چندر نے رپوڑتاژ بھی لکھے ہیں جن میں پودے 1947' ترقی پسند کی کانفرنس پر مکمل تفصیل قلم بند کی ہے اور صبح ہوتی ہے 1950 شامل ہیں۔

طلسم خیال کے افسانے: جہلم میں ناؤ پر 1937' اندھا چھتر پتی 1937' مجھے کتے نے کاٹا 1937' تالاب کی حسینہ 1938' آنگی' صرف ایک آنہ 1938' لاہور سے برام گلہ تک 1936' ماما 1936' قبر 1938' گوماں' مصور کی محبت' یرقان 1936۔

کرشن چندر کے ناول: شکست 1943۔ جب کھیت جاگے 1952۔ طوفان کی کلیاں 1954۔ دل کی وادیاں سوگئیں 1956۔ آسمان روشن ہے 1957۔ باون پتے 1957۔ ایک گدھے کے سرگذشت -1957 ایک عورت

مضامین

ہزار دیوانے 1957۔ غدار 1960۔ سڑک واپس جاتی ہے 1961۔ دادر پل کے بچے 1961۔ برف کے پھول 1961۔ میری یادوں کے چنار 1962۔ گدھے کی واپسی 1962۔ یورین کلب 1962۔ درد کی لہر دسمبر 1963' لندن کے سات رنگ۔ مٹی کے صنم 1961۔ کاغذ کی ناؤ۔ گنگا بہے نہ رات 1966۔

مضامین: فلمی قاعدہ طنزیہ 1966۔ پانچ لوفر 1966۔ پانچ لوفر ایک ہیروئین۔ ہانگ کانگ کی حسینہ 1967۔ دوسری برف باری سے پہلے 1967۔ گوالیار کا حجام 1969۔ بمبئی کی شام ۔ چندا کی چاندنی 1971۔ ایک کروڑ کی بوتل 1971۔ مہارانی 1971۔ پیار ایک خوشبو 1971۔ مشینوں کا شہر ماخوذ 1971۔ کارینوال ماخوذ۔ آئینے اکیلے ہیں 1972۔ چنبل کی چنبیلی 1973' اس کا بدن میرا چمن 1974۔ سونے کا سنسار 1976۔ محبت بھی قیامت بھی 1974۔ سپنوں کی وادی 1977۔ آدھا راستہ 1977۔ ہونولولو کا راج کمار۔ سپنوں کی رہگذر میں۔ فٹ پاتھ کے فرشتے۔

ڈرامے: دروازہ۔ حجامت۔ نیل کنٹھ۔ قاہرہ کی ایک شام۔ بے کاری۔ سرائے کے باہر۔ دروازے کھول دو۔ منکیک۔ بدصورت راج کماری۔ جھاڑو۔ ہم سب غلیظ ہیں۔ شکست کے بعد۔ ایک فسطائی کی ڈائری۔ ایک روپیہ ایک پھول۔ ہائیڈروجن بم کے بعد۔ عشق کے بعد۔ کتاب کا کفن۔ نقش فریادی۔

بچوں کا ادب: بے وقوفوں کی کہانیاں۔ سونے کی صندوقچی۔ چڑیوں کی الف لیلہ۔ شیطان کا تحفہ۔ الٹا درخت۔ لال تاج۔ سونے کا سیب۔ ستاروں کی سیر۔ خرگوش کا سپنا۔ ہمارا گھر۔ بہادر گار جنگ۔

اس مضمون میں کرشن چندر کے ناولوں۔ افسانوں۔ ڈراموں' رپورتاژ اور بچوں کے ادب پر ان کی تحریروں کی تفصیل دی گئی ہے۔ امید کہ ان تفصیلات سے قارئین کو کرشن چندر فہمی میں مدد ملے گی۔ انھوں نے اردو کی نثری اصناف ناول۔ افسانے۔ ڈرامے۔ رپورتاژ اور بچوں کا ادب تخلیق کر کے اردو زبان و ادب کو مالا مال کیا۔ اردو افسانے اور ناول کی تاریخ میں کرشن چندر کا نام ہمیشہ تابندہ اور درخشاں رہے گا۔ ان کے بغیر افسانہ اور ناول کی تاریخ مکمل نہیں ہوگی۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد ناظم علی

سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج' موڑتاڑ
اکیڈمک سینٹ ممبر' تلنگانہ یونی ورسٹی۔

Cell: 9603018825

اپنے خیالوں کی حفاظت کرو
کیونکہ یہ تمھارے الفاظ بن جاتے ہیں
اپنے الفاظ کی حفاظت کرو
کیونکہ یہ تمھارے اعمال بن جاتے ہیں
اپنے اعمال کی حفاظت کرو
کیونکہ یہ تمھارے کردار بن جاتے ہیں
اور اپنے کردار کی حفاظت کرو
کیونکہ یہ تمھاری پہچان بن جاتے ہیں

پنڈت رتن ناتھ سرشار

پنڈت رتن ناتھ سرشار (1901 - 1846ء) لکھنوئی تہذیب کے نمائندہ ناول نگار گزرے ہیں۔ اپنے ناول ''فسانہ آزاد'' کے سبب اردو ادب کی تاریخ میں شہرت رکھتے ہیں۔ سرشار لکھنؤ میں ایک کشمیری گھرانے میں پیدا ہوے۔ ابھی چار سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ لکھنؤ ہی میں تعلیم حاصل کی اور عربی، فارسی اور انگریزی سے واقفیت حاصل کی۔ ایک اسکول میں مدرس مامور ہوئے اور ''اودھ اخبار'' اور ''مراسلہ کشمیری'' میں مضامین لکھنے لگے۔ اپنی خداداد قابلیت کی وجہ سے جلد ہی شہرت حاصل کر لی اور 1878ء میں انہیں ''اودھ اخبار'' کا ایڈیٹر مقرر کر دیا گیا۔ اسی اخبار کی ادارت کے دوران اپنا شاہکار ناول فسانہ آزاد لکھا۔ کچھ عرصہ تک الہ آباد ہائی کورٹ میں مترجم کی حیثیت سے کام کیا۔ 1895ء میں حیدرآباد چلے آئے۔ مہاراجہ کشن پرشاد نے دوسو روپیہ وظیفہ مقرر کیا۔ حیدرآباد میں قیام کے دوران اخبار ''دبدبہ آصفیہ'' کی ادارت کرتے رہے۔ آخر عمر میں شغل شراب نوشی حد سے بڑھ گئی تھی۔ چنانچہ اس عادت نے صحت پر برا اثر ڈالا اور 27 جنوری 1903ء کو وفات پا گئے اور اپنے وطن سے دور انہیں حیدرآباد ہی میں نذر آتش کیا گیا۔ سرشار کی تصانیف میں فسانہ آزاد، سیر کہسار، جام سرشار، کامنی، پدمنی، چنچل نار، ہشؤپی کہاں، طوفان بے تمیزی، کڑم دھم، بچھڑی دلہن، گورغریباں، خدائی فوجدار، شمس الضحیٰ، اعمال نامہ روس، رنگے سیار اور الف لیلیٰ وغیرہ شامل ہیں۔

اردو ادب اور اردو ناول کی تاریخ میں ڈپٹی نذیر احمد کے بعد انہیں کافی شہرت حاصل ہوئی۔ سرشار کی شہرت کا دارومدار فسانہ آزاد پر ہے۔ اس ناول کے بارے میں ایک قول مشہور ہے کہ فسانہ آزاد سرشار کی وجہ سے مشہور ہوا اور ان کی دیگر تصانیف فسانہ آزاد کی وجہ سے مقبول ہوئیں۔ فسانہ آزاد کی وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے پریم پال اشک لکھتے ہیں:

''جب حضرت سرشار کھیڑی سے لکھنو واپس آئے تو یہاں شب و روز یاران دقیقہ رس و صحیح نفس کی صحبت میں گزرتے تھے اسی صحبت میں جہاں ایک سے ایک حاضر جواب وطرار موجود رہتا تھا وہاں منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ اور پنڈت تربھون ناتھ ہجر نے کہا کہ اگر کوئی ناول ایسا ہے کہ جس کا ایک صفحہ پڑھیں اور ممکن نہیں کہ بیس مرتبہ نہ ہنسیں تو وہ ڈان کوئکساٹ ہے اگر اردو میں اس طرز کا فسانہ لکھا جائے تو خوب ہے حضرت سرشار کے دل پر اس وقت کی بات ایسی کارگر ہوئی کہ اردو میں ڈان کوئکساٹ کے انداز پر مضامین لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ اودھ اخبار میں ظرافت کے عنوان سے مختلف مضامین شائع ہونے لگے۔ یہ مضامین عموماً لکھنو کے رسم ورواج کے متعلق ہوا کرتے تھے مثلاً کبھی محرم پر مضمون نکل گیا کبھی چہلم پر اور کبھی عیش باغ کے میلے پر۔ اس وقت تک لوگوں کا یہ خیال تھا کہ دس بیس مضامین نکل کر یہ سلسلہ ٹوٹ جائے گا اور حضرت سرشار کا بھی یہ منشا ہو مگر لوگوں کو یہ سلسلہ ایسا بھایا کہ اس کے قائم رکھنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ مختلف مضامین گوندھ کر فسانے کا سلسلہ نکالا گیا اس طرح فسانہ آزاد کی بنیاد دسمبر 1878ء میں پڑی۔ اور نثری ادب کا یہ شاندار قصر پورے ایک سال بعد دسمبر ۱۸۷۹ء میں بن کر تیار ہوا۔ اور اگلے سال یعنی 1880ء میں یہ افسانہ چار جلدوں میں پوری تقطیع کے تقریباً سوا تین ہزار صفحات پر مشتمل کتابی شکل میں بھی شائع ہو گیا۔'' (پریم پال اشک مرتبہ۔ سرشار ایک مطالعہ۔ ص ۱۱۱۔ دہلی 1964ء)

فسانہ آزاد کا قصہ یہ ہے کہ ''میاں آزاد ایک دولت مند نوجوان ہیں۔ حسن آراء پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ وہ ان سے اس شرط پر شادی کرنے کے لیے رضامند ہوتی ہے کہ پہلے وہ ترکی جائیں اور لشکر اسلام میں شامل ہو کر روسیوں کے خلاف لڑیں۔ آزاد اس شرط کو پورا کرنے کے لیے ترکی جاتے ہیں اور سرخرو ہو کر واپس آتے ہیں۔ سرشار نے جب لکھنا شروع کیا تو اس وقت اردو کی بنیاد بالخصوص لکھنؤ میں سرور کے انداز پر قائم تھی اس لیے ایک نومشق کے لیے اس سے متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ لیکن سرشار نے جس وقت فسانہ آزاد لکھنا شروع کیا تو اس وقت ان کا اپنا طرز نگارش بن چکا تھا۔ طرز تحریر کی اس تبدیلی کا باعث ان کی طبعی ظرافت ہے۔

سرشار کو منظر نگاری میں کمال حاصل تھا۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو ادب کو منظر کشی اور عکاسی کے صحت منداجزاء بخشے۔ وہ ایک شاعر کا دماغ اور مصور کی آنکھ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں ان کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کر دیتے ہیں۔ وہ لکھنؤ کی زندگی اور وہاں کی معاشرت

سے پوری طرح واقف ہیں۔اس لیے واقعہ کی جزیات کو نظر انداز نہیں کرتے۔لکھنو کے بازار کا منظر سرشار یوں بیان کرتے ہیں:

''چوک کی سیر کو گئے تو دیکھتے کیا ہیں کہ دورویہ بازار آراستہ دکانیں قرینے سے سجی سجائی'اشیا سلیقے سے چنی چنائی۔حلوائی کی دکان شہد وشکر کی دکان' تھالوں میں مٹھائی اوراس پر ورق نقرہ۔گاہک پرگاہک آرہے ہیں۔افیمی پرافیمی ٹوٹے پڑے ہیں۔گوٹے والوں کی دکانوں پر بھیڑ بھڑ کا ہے۔کوئی لالہ سے تول مول کرتا ہے کوئی منیب جی سے بھاؤ چکاتا ہے۔صرافے میں کھنا کھن اور چھنا چھن کی آوازیں آتی ہیں۔دورتک دکانوں کی قطار ہے۔اور ہر طرف اشرفیوں کا انبار ہے۔اور جو ہے وہ کامل عیار ہے۔زبان حال وخال سے پکارر ہے ہیں شرف الانسان بالامال لایا یا کمال۔دلالوں کی چاندی ہے''۔

(بہ حوالہ۔سرشار ایک مطالعہ ص124ء)

سرشار کے اس طرز تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا اسلوب مقفی اور مسجع ہے اوران کے اسلوب پر سب رس اور دیگر نثری داستانوں کا انداز غالب ہے۔اردو نثر میں داستانوی ادب کے بعد ادب لطیف کا اثر واضح تھا جس میں یلدرم اور دیگر کی تحریریں نثر میں شاعری کا مزہ پیش کررہی تھیں۔

سرشار کو کردار نگاری میں کمال حاصل ہے۔ان کے کردار اپنی ذات اور جماعت کی نمائندگی کرتے ہیں۔انہوں نے اردو ادب کو''خوجی'' کی شکل میں ایک ایسا چلتا پھرتا اور جیتا جاگتا نمونہ دیا ہے،جس کی مثال مشکل سے ملے گی۔فسانہ آزاد میں آزاداور خوجی کے کردار اہم ہیں۔آزاد کا کردار ایک آوارہ انسان کا کردار ہے جو جہاں جاتا ہے اپنی لچھے دار زبان سے لوگوں کو گرویدہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔سرشار نے آزاد کو واقعی ایک آزاد ذہن کے انسان کے طور پر پیش کیا ہے جو قدیم رسم ورواج اور توہم پرستی سے گریز کرتا ہے۔فسانہ آزاد کا دوسرا اہم کردار خوجی ہے۔جو آزاد کا دوست ہے۔اسے احساس برتری تھا وہ نہ کسی سے گھبراتا ہے اور نہ کسی سے ڈرتا ہے۔لوگوں سے اکڑ کر بات کرتا ہے۔خوجی زوال آمادہ جاگیردارانہ تمدن کا خاص کردار ہے ہماری مٹتی ہوئی تہذیب اور معاشرت پر وہ ایک بھرپور طنز ہے۔ان لوگوں پر بھی طنز ہے جو مذہب اور دھرم کی آڑ میں ہماری مٹتی ہوئی بوسیدہ اور کہنہ تہذیب ہی کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں۔

ناول فسانہ آزاد کو فنی لحاظ سے مکمل ناول نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ اس میں ربط اور تسلسل نہیں ہے۔البتہ اس میں لکھنوی زندگی کی جو تصاویر ہیں اور سرشار نے آزاد اوراس کے دوست خوجی کا جو نقشہ پیش کیا ہے،ان سب نے مل کر اس معمولی قصے کو نہایت دلچسپ بنادیا ہے۔منظر نگاری، معاشرتی اور تہذیبی حالات کی عکاسی،انسانی نفسیات کا مطالعہ،محاورات کی صفائی،شوخی وظرافت ان سب نے مل کر فسانہ آزاد کو اردو ادب میں ایک اہم مقام دے رکھا ہے۔

ناول فسانہ آزاد کا پلاٹ غیر مربوط ہے۔اس ناول کے پلاٹ کے جو حصے ہیں ان میں چھ پہلو اس طرح ہیں۔''ا۔آزاد اور حسن آرا کا قصہ، ۲۔دوسرا قصہ ہمایوں فر اور حسن آرا کی بہن سہ پہر کے عشق سے تعلق رکھتا ہے،۳۔تیسرے قصہ میں نواب ذوالفقار علی خاں کی بٹیر بازی کا قصہ بیان کیا گیا ہے،۴۔اللہ رکھی بازاری عورت ہے جو زندگی میں مختلف طبقوں سے گذرتی ہوئی دکھائی جاتی ہے،۵۔خوجی کے آزاد کے ساتھ اور الگ رہ کر مختلف واقعات میں پھنسنے کا قصہ ہے،۶۔متعدد چھوٹے قصے جو محلات میں پیدا ہوتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں''۔سرشار کی تحریروں میں شوخی و ظرافت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔وہ جس کے بارے میں لکھتے ہیں اس کی سچی تصویر پیش کر کے رکھ دیتے ہیں۔ان کی ظرافت کسی ماحول کی محتاج نہیں۔وہ پوری زندگی کو اپنا موضوع بنالیتے ہیں۔وہ واقعات کے ساتھ شوخی وظرافت کے ایسے شگوفے شامل کر دیتے ہیں کہ ہر پڑھنے والا ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا۔وہ خود بھی ہنستے ہیں اور دوسروں کو بھی اس ہنسی میں شریک کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔سرشار کی زبان میں وسعت ہے۔ان کے پاس الفاظ کا بے بہا ذخیرہ موجود ہے۔وہ صاف،بامحاورہ اور زوردار عبارت لکھتے ہیں۔نیز کردار کے مطابق زبان استعمال کرتے ہیں یعنی نوابوں کی زبان نوابوں جیسی اور بچوں کی زبان ایسے ہی عامیانہ الفاظ پر مشتمل ہے۔جیسا موقع محل ہوتا ہے اس کے مطابق الفاظ لاتے ہیں۔

فسانہ آزاد پنڈت رتن ناتھ سرشار کی ایسی معرکتہ الآرا تصنیف ہے،جس نے نہ صرف یہ کہ سرشار کو تاریخ اردو ادب کے صفحات میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کردیا؛ بلکہ اردو ادب کو ایک نئی زبان،نیا اسلوب وانداز اور نئے طرز فکر سے آشنا کیا،سرشار نے ایسے ماحول میں آنکھیں

کھولی تھیں جہاں داستان گوئی اور مافوق الفطرت عناصر پر یقین کرنے کا عام رواج تھا، عام طور پر داستان گو حضرات طلسم وسحر اور مافوق الفطرت عناصر کے ذریعہ اپنی کہانیوں کو رنگین اور دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے تھے، مگر سرشار نے ایک نئی راہ نکالی اور اپنی شاہ کار تصنیف جسے کوئی داستانی ناول، کوئی صحافتی ناول تو کوئی داستان اور ناول کے درمیان کی کڑی کہہ کر پکارتا ہے، اس میں ماحول ومعاشرہ کی ترجمانی اور عکاسی اس انداز سے کی کہ پوری دنیائے اردو ادب حیران رہ گئی، اپنی اس لاجواب تصنیف میں سرشار نے نہ صرف یہ کہ عمدہ زبان، نئے الفاظ، دلفریب محاورے، فصیح وبلیغ جملے اور چست بندشیں شامل کر کے اپنی زبان دانی اور فنکاری کا ثبوت دیا ہے، وہیں اپنے قارئین کو بولنے کا سلیقہ اور معاشرہ کو سمجھنے کا طریقہ بھی بتلایا، ان کا پلاٹ اگرچہ کمزور ہے؛ مگر کرداروں اور ان کے مابین ایک اچھوتے انداز سے مکالمہ کرا کے اس کمی کو دور کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ اس کی ادبی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ یہ پہلا ایسا شہ پارہ ہے جو کتابی شکل میں شائع ہونے سے پہلے قبولیت عام حاصل کر چکا تھا اور سرشار کو مبارکبادیوں کے سینکڑوں خطوط موصول ہونے شروع ہو گئے تھے۔ رتن ناتھ سرشار کا یہ داستانی ناول چوں کہ قسط وار اودھ پنچ اخبار میں شائع ہوا تھا، اس لیے پلاٹ میں نحافت اور ضعف ہے، مگر اس کی کمی مزاحیہ اور لازوال کردار خوجی نے کر دی ہے اور سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ جیسا کردار استعمال کیا ہے ویسی ہی زبان بھی۔ نواب کی گفتگو نوابی انداز میں ہے اور بھٹیارن کی اسی کی طرح۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ کے تہذیب ومعاشرت کو سرشار کس قریب سے دیکھتے، سمجھتے اور جانتے تھے۔ انہوں نے سرور کی تقلید میں مسجع اور مقفی جملے ضرور استعمال کیے ہیں، مگر ایسا ماحول تیار کر دیا ہے کہ قاری پر ذرہ برابر اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا اور وہ کچھ اور کچھ کے طلب میں غرق ہو جاتا ہے۔ سرشار کے دیگر ناولوں کا تعارف پیش ہے۔

سیر کوہسار: سرشار کا یہ ناول دو قسطوں میں شائع ہوا۔ یہ ناول اودھ اخبار میں فسانہ لطیف کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس ناول میں ایک لکھنوی نواب کی عیاشی کی داستان بیان کی گئی ہے۔ جو قمرن نامی خاتون کے عشق کے مبتلا ہو جاتے ہیں نواب کی بیگم نیک صفت تھی۔ قمرن کی موت کے بعد نواب کی بیگم کا گھر پھر بس جاتا ہے۔ تکنیک کے لحاظ سے ناول پختہ ہے اس میں صحافت کی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ اس ناول میں سرشار کی زبان بہتر ہے اور لکھنوی تہذیب کی جھلک اچھے انداز میں ناول میں پیش کی گئی ہے۔

جام سرشار: یہ بھی ایک واقعاتی اور کرداری ناول ہے۔ اس ناول میں بھی ایک عیش پرست نواب کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو گھوڑ دوڑ کا شوقین تھا۔ نواب کی مئے نوشی کو ناول میں پیش کرتے ہوئے مئے نوشی کے نقصانات بیان کیے گئے ہیں۔

کامنی: یہ سرشار کا ایک کرداری ناول ہے۔ جس میں ایک ہندو گھرانے کی لڑکی کا ذکر کیا گیا ہے جو اپنی مرضی کی شادی چاہتی ہے۔ کامنی کا گھرانہ قدامت پسند تھا تاہم کئی مصائب جھیلنے کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ناول میں ہندوستان کے قدیم رسم ورواج اور پابندیوں کے خلاف آواز اٹھانے کی کوشش کی ہے۔

پی کہاں: یہ سرشار کا ایک مختصر سا ناولٹ ہے جس ایک ایسے شہزادے کی داستان بیان کی گئی ہے جو دق کی بیماری میں مبتلا ہے۔ وہ اپنے محبوب سے ملنا چاہتا ہے لیکن مل نہیں سکتا اور یہی حسرت لیے موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

ہشو: یہ ایک کرداری ناولٹ ہے جس میں ایک ایسے ہندو سیٹھ کا کردار بیان کیا گیا ہے جو شراب نوشی کی کثرت کی وجہ سے بیمار پڑ جاتا ہے۔ بعد میں وہ شراب نوشی ترک کر کے نیک انسان بن جاتا ہے اور شراب پینے اور اس کا کاروبار کرنے والوں کی خوب گت بناتا ہے۔ اسے ایک اصلاحی ناولٹ کہا جا سکتا ہے۔

کڑم دھڑم: یہ سرشار کا ایک طویل افسانہ ہے جس میں انہوں نے شادی کی قبیح رسوم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہے۔ نوشابہ نامی لڑکی کی شادی نواب کے لفنگے لڑکے سے طے کی جاتی ہے' لڑکی اس شادی کی مخالفت کرتی ہے۔ بعد میں اس کا نکاح پھوپھی زاد بھائی سے ہو جاتا ہے اور

نواب یہ منظر دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

طوفان بے تمیزی: اس ناول میں واضح کیا گیا کہ کس طرح ایک افواہ سے شہر میں گڑ بڑ مچ جاتی ہے۔ایک مندر میں جاتی ہندو لڑکی کو مسلمان لڑکوں کی جانب سے چھیڑنے پر مچے ہنگامے کو ناول کا مرکزی خیال بنایا گیا۔

خدائی فوجدار: یہ اسپینی ناول کا ترجمہ ہے جسے سرشار نے اپنے مخصوص اسلوب میں پیش کیا۔اس ناول کا مرکزی کردار اپنی احمقانہ حرکتوں سے لوگوں کے لیے تفریح کا سامان فراہم کرتا ہے۔

''ڈاکٹر یوسف سرمست نے اپنے ناول ''بیسویں صدی میں اردو ناول'' میں سرشار کی ناول نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''نذیر احمد کے بعد سرشار کی ناول نگاری گونا گوں خصوصیات کی بنا پر بڑی اہم قدر و قیمت رکھتی ہے۔سرشار نے زندگی کے پھیلاؤ اور اس کی گہرائی کا احاطہ کرنے کی طرح ڈالی۔گوانہوں نے صرف لکھنو کے معاشرے اورس کی زندگی کو پیش کیا ہے لیکن اس معاشرے کی یہ ایسی مکمل اور جامع تصویر ہے کہ اس میں زندگی کا ہر پہلو ملتا ہے' ہر جذبہ ملتا ہے۔اس میں محلوں سے لے کر بازار تک' زاہدان خشک سے رنگین مزاجوں تک' بیگمات سے لے کر مہریوں تک' حرم سراؤں سے کوٹھوں تک' معشوقان عشق پیشہ کی عیاریوں سے لے کر حسن پردہ نشین کی سادہ پر کاریوں تک' ہر مقام اور ہر شخص کا حال سچا بھی ہے اور دلاویز بھی ہے اور اس طرح سرشار کے ہاں دیوزادوں کی وسعت خیالی ملتی ہے۔زندگی کے مختلف پہلو سرشار اس لیے پیش کرنے میں کامیاب ہوسکے کہ وہ خود ایک رند مشرب آدمی تھے۔انہوں نے ہر رنگ اور ہر صحبت کو دیکھا ہے۔زندگی کی وسعت کا احاطہ کرنا ناول کا بہت بڑا اور اہم ترین منصب ہے۔'' (یوسف سرمست۔بیسویں صدی میں اردو ناول:ص ۴۰)

مجموعی طور پر سرشار کی تحریریں انیسویں صدی کے اواخر کے لکھنو کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتی ہیں۔ایک ایسے دور میں جب کہ لوگوں کے پاس تفریح کے دیگر سامان مہیا نہیں تھے لوگ دلچسپ تحریروں کے مطالعے سے اپنا جی بہلاتے تھے اور اس دور کے نثر نگار بھی اپنے دلچسپ اسلوب نگارش کے ساتھ اپنے شاہکار پیش کرتے رہے۔سرشار بھی اس دور کے نمائندہ نثر نگار تھے جن کی تحریریں آج بھی لکھنوئی تہذیب کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتی ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی

پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج ظہیر آباد فون:9247191548

عبرت حاصل کرنا

شیر' بھیڑا اور لومڑی اکٹھے مل کر شکار کو نکلے۔ان کو شکار میں نیل گائے' جنگلی بکرا اور خرگوش ہاتھ آئے۔شیر نے دیکھا کہ بھیڑیا اور لومڑی بھی اس شکار میں اپنے حصے کی خواش رکھتے ہیں۔اس نے ان کی نیتوں کو بھانپ کر پہلے بھیڑیے کو بلایا کہ وانصاف سے تقسیم کرے۔بھیڑیے نے کہا ''بادشاہ سلامت آپ بڑے ہیں' نیل گائے آپ کا حصہ' جنگلی بکرا درمیانہ ہے وہ میرا حصہ ہے جب کہ خرگوش لومڑی کا حصہ ہے''۔شیر نے کہا ''میرے آگے تیری کیا ہستی ہے کہ میرے ہوتے ہوئے تو انصاف کرے''۔اس نے بھیڑیے کو قریب بلا کر اس زور سے پنجہ مارا کہ وہ فوراً ہلاک ہوگیا۔اس کے بعد اس نے لومڑی کو بلایا اور تقسیم کے لئے کہا۔لومڑی نے باادب ہوکر کہا ''جناب تقسیم کیسی یہ نیل گائے آپ کے صبح کا ناشتہ ہے' جنگلی بکرا دوپہر کو اور خرگوش رات کو تناول فرمالیجئے گا''۔ شیر اس کی بات سے بہت خوش ہوا اور اس کی انصاف پسندی کی داد دیتے ہوئے اس سے پوچھا کہ ''یہ انصاف کی تقسیم تم نے کہاں سے سیکھی''۔لومڑی نے کہا ''جناب بھیڑیے کے انجام سے''۔چنانچہ شیر نے خوش ہوکر وہ تینوں شکار لومڑی کو بخش دیے۔

درس حیات: ☆دوسروں کے انجام سے عبرت حاصل کرنا عقلمندوں کا شیوہ ہے۔ ☆یہ ان کو انجام بد سے بچالیتا ہے۔ (حکایات رومی)

oOo

پنڈت راگھویندر راؤ جذبؔ عالم پوری

''جذبؔ مسلمان نہیں ہندو ہیں۔ دہلوی یا لکھنوی نہیں دکھنی ہیں۔ کایستھ یا کشمیری نہیں دکھنی برہمن ہیں۔ ان سب کے باوجود اردو کے پرانے خادم ہیں''۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے یہ کلماتِ صدق، دکن کے جس شاعر کے بارے میں ہیں اس کا نام پنڈت راگھویندر راؤ اور تخلص جذبؔ ہے۔ جذبؔ عالپوری 20/اپریل 1894ء کو تعلقہ گنگاوتی ضلع رائچور (کرناٹک) میں پیدا ہوئے۔ (مالک رام، تذکرہ معاصرین، جلد دوم، ص 193)۔ اس وقت ضلع رائچور سلطنت آصفیہ میں شامل تھا۔ ان کے والد کا نام پنڈت رام راؤ تھا۔ جذب کوئی دو سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ تعلقہ عالم پور (ضلع محبوب نگر، تلنگانہ، آندھرا پردیش) کی ایک مالدار اور صاحب جائداد برہمن بیوہ سیتا بائی نے جذبؔ کو اپنا متبنٰی بنالیا اور انھیں اپنے ساتھ عالم پور لے آئیں۔ عہد آصفیہ میں عالم پور ضلع رائچور (کرناٹک) کا حصہ تھا۔ میر محبوب علی خاں آصف سادس کے زمانے میں نئی ضلع بندی کے تحت اسے ضلع محبوب نگر میں شامل کیا گیا۔ چونکہ یہ تعلقہ تلنگانہ کی سرحد پر واقع ہے اس لیے جذب خود کو ''پروردہ سرحد تلنگانہ'' کہتے تھے۔ سیتا بائی نے نہایت خوش اسلوبی سے جذب کی پرورش و پرداخت کی۔ ان کی تعلیم کا بہترین انتظام کیا۔ جذب کی مادری زبان کنڑی تھی۔ تلگوان کی دوسری مادری زبان تھی کیونکہ یہ ان کی منہ بولی ماں سیتا بائی کی زبان تھی۔ جذبؔ نے کنڑی زبان اپنے چچا مادھوراؤ سے سیکھی جو وکیل تھے۔ اردو اور فارسی پنڈت رام نرسو سے پڑھی اور عربی زبان کی تعلیم سید مخدوم حسینی عرف خواجہ پیراں سے حاصل کی۔ سنسکرت اور ہندی پڑھانے کے لیے بھی پنڈت مقرر کیے گئے تھے۔ جذب کے چچا وکیل تھے۔ چچا کی طرح وہ بھی وکیل بننا چاہتے تھے۔ انھوں نے قانون کی تعلیم حاصل کی اور جوڈیشیل (قانون) کے امتحان میں شریک ہوئے اور وکالت کی سند حاصل کی۔ لیکن اس میدان میں زیادہ کامیاب نہیں رہے۔

جذبؔ کرناٹک کے برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اردو ان کی مادری زبان نہیں تھی لیکن بچپن ہی سے انھیں اردو سے لگاؤ تھا۔ اسی لگاؤ کی وجہ سے وہ اردو شاعری کے کوچے میں آئے۔ ''رباعیات جذب'' میں ''عرض مصنف'' کے تحت اپنے شاعر بننے کا ماجرا یوں بیان کیا ہے:

''میں برہمن قوم کی ایک فرد [فروع] سے ہوں۔ میری پیدائش خالص کرناٹک (دکن) کی ہے مگر بچپن سے زبان اردو کا دلدادہ ہوں۔ میری تعلیم کے زمانے میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا اور جس کا اثر ایسا ہوا کہ نظم کی کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا اور اس مطالعے کے سبب نظم کہنے کا شوق ہوا............ یوں تو غزلیات قطعات ترجیع بند وغیرہ کہہ چکا ہوں مگر وہ محض اخلاقی، جن کو نثر نما نظم کہا جاسکتا ہے۔ البتہ رباعی کہنے کا ابتدا سے شوق ہے اور اس صنف کی طرف طبیعت زیادہ راغب ہے''۔ (رباعیات جذب، ص 16)

جذب نے طالب علمی کے زمانے میں پیش آنے والے واقعہ کا صرف ذکر کیا ہے مگر اس کی وضاحت نہیں کی کہ یہ کیا واقعہ تھا۔ تاہم ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ایسا تھا جس نے ان کا رُخ شاعری کی طرف موڑ دیا۔ اور وہ طالب علمی کے زمانے ہی سے جب کہ ان کی عمر سولہ سال کی تھی فکرِ سخن کرنے لگے۔ اس زمانے میں احمد حسن شوکت میرٹھی کی استادی کا بڑا شہرہ تھا۔ جذب نے انہی کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا۔ ان کی صلاحیتوں کو تاڑ کر شوکت میرٹھی توجہ سے ان کا کلام بنانے لگے۔ جذبؔ تخلص بھی انہی کا عطا کردہ ہے۔ شوکت میرٹھی کی وفات کے بعد جذب نے سید نظیر حسن سخاؔ دہلوی کو اپنا استادِ سخن بنایا۔ سخاؔ سے انھوں نے خاص طور پر عروض کی تعلیم حاصل کی۔ ان دو اساتذہ کے علاوہ جذبؔ نے ترک علی شاہ ترکی، جگر بریلوی اور امجد حیدرآبادی سے بھی مشورہ سخن کیا۔ ان اساتذہ کے فیض تربیت سے جذبؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں کو پروان چڑھنے اور نکھرنے کا موقع ملا۔

جیسا کہ مذکور ہوا ہے جذب کو بچپن ہی سے اردو زبان سے دلچسپی تھی۔ وہ اردو کے والہ وشیدا تھے۔ اردو سے ان کی بے لوث محبت کو دیکھ کر لوگ انھیں ''محبِّ اردو'' کہتے تھے لیکن وہ اپنے آپ کو ''خادم اردو'' لکھا کرتے تھے۔ عالم پور میں انھوں نے ''بزم نہال سخن'' کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی تھی جس کا مقصد لوگوں میں اردو زبان اور شعر و ادب کا ذوق پیدا کرنا تھا۔ کوئی دس، بارہ سال تک بزم نہال سخن کے ماہانہ اجلاس اور سالانہ مشاعرے نہایت کامیابی کے ساتھ منعقد ہوتے رہے جن کی بدولت ریاست حیدرآباد کے دور افتادہ خطوں میں اردو زبان کی ترویج ہوئی اور متعدد موزوں طبع لوگ

شاعری کی طرف راغب ہوئے۔

مملکت آصفیہ کے خاتمے (1948ء) کے بعد جذب عالم پور سے نقل مکانی کر کے حیدرآباد آ گئے۔ حیدرآباد منتقل ہونے کے بعد جذبؔ استغراق کے ساتھ اردو کی خدمت میں منہمک ہو گئے۔ شاعری ان کا اوڑھنا، بچھونا تھی۔ عنفوان شباب سے عروس سخن کی زلفیں سنوارتے وہ کہولت کو پہنچے۔ انھوں نے قریباً اسی برس کی عمر پائی، انھیں کوئی عارضہ نہیں تھا لیکن کبرسنی کی وجہ سے ضعف لاحق ہو گیا تھا۔ اسی ضعف کی حالت میں 27 اور 28 ستمبر 1973 کی درمیانی شب ان کا طائرِ روح قفس عنصری سے آزاد ہو گیا۔

پنڈت راگھوبندر راؤ جذبؔ عالم پوری کہنہ مشق اور خوش فکر سخنور تھے۔ انھوں نے غزلیں بھی لکھیں اور دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ ''سازِ غزل'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے لیکن صنف رباعی میں انھیں بڑی قدرت اور مہارت حاصل تھی۔ وہ رباعی کے قادرالکلام شاعر تھے۔ حالانکہ رباعی نہایت مشکل صنف سخن ہے جس کے وزن میں غالبؔ جیسا عالی مرتبت سخنور بھی دھوکا کھاتا ہے لیکن جذب کو اس صنف سے طبعی مناسبت تھی۔ رباعی سے ان کی شیفتگی تو غل کے درجے کو پہنچی ہوئی تھی۔ اخلاقی مضامین، پند و موعظت، سیدھی سادی نصیحت آمیز باتوں اور دانش مندانہ ضرب الامثال کو نہایت سادگی اور برجستگی کے ساتھ رباعی کے سانچے میں ڈھالنے میں انھیں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ انھوں نے سیکڑوں رباعیاں لکھیں اور ہمیشہ اس صنف کے فنی تقاضوں کو ملحوظ رکھا، کبھی اس کے معیارات کو مجروح نہیں کیا۔ اردو کے بلند پایہ نقادوں نے ان کے اس جوہر کمال کی کھلے دل سے داد دی ہے۔ نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں:

''آپ کی رباعیات تعریف سے مستغنی ہیں۔ ہر رباعی کلاسیکی ادب کی شان رکھتی ہے کیونکہ اس میں رچا ہوا انداز بیان بھی ہے اور صاف ستھری شگفتہ زبان بھی۔ یکسر اردوئے معلیٰ کا نمونہ ہے''۔

صنف رباعی میں خمریات اور شبابیات کے مضامین کی بڑی گنجائش ہے۔ عمر خیام کی رباعیات سامنے کی مثال ہیں لیکن جذب سنجیدہ اور سلیم الطبع انسان تھے۔ انھوں نے اس کوچے میں قدم نہیں رکھا اور اپنے فن کو حسن و عشق کے معاملات اور شراب و شباب کی حکایات کے اظہار کا وسیلہ نہیں بنایا۔ انھوں نے جوانی میں بوڑھے آدمی کی طرح دنیا کو دیکھا اور اپنے تجربات، مشاہدات اور ذہنی موثرات کو حکیمانہ رباعیات کی شکل میں پیش کیا۔ ان کی رباعیات قاری کے دامن کو علم و دانش اور فہم و فراست کے موتیوں سے بھر دیتی ہیں۔ جذب کی رباعیات عام زندگی کی ایسی بصیرت عطا کرتی ہیں جس کی روشنی میں انسان زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھ سکتا ہے اور خیر و شر میں تمیز کر سکتا ہے۔ ان کی رباعیات میں پند پیر دانا کا انداز پایا جاتا ہے۔ یہ قاری کو نہ صرف شعور و آگہی بخشتی ہیں بلکہ نیکی و صداقت پر گامزن رہنے اور بلند نصب العین و اعلیٰ اخلاقی قدروں کے ساتھ زندگی گزارنے کی ترغیب بھی دیتی ہیں۔

جذب نے اخلاق و دانائی کا سرمایہ جہاں ملا اسے سمیٹا اور اپنا لیا۔ انھوں نے سنسکرت، تلگو اور کنڑا زبانوں میں پند و نصیحت، اخلاق و آداب اور علم و حکمت کی جو پونجی ملتی ہے اس سے خوشہ چینی کی اور اسے اردو زبان میں رباعیات کی شکل میں پیش کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اردو والے دیگر زبانوں کے اخلاقی اور عقل افروز ادب سے واقف ہوں۔ جذبؔ پُرگو اور کثیرالتصانیف سخنور تھے، ذیل میں ان کی تصانیف کا تعارف پیش کیا گیا ہے:

رباعیات جذب: یہ جذب کی رباعیات کا پہلا مجموعہ ہے جو نظامی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ یہ ایک سو رباعیات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں جذب کی طبع زاد رباعیوں کے علاوہ سنسکرت اور تلگو زبان کی شاعری سے ماخوذ مضامین پر مبنی رباعیاں بھی شامل ہیں۔ اس مجموعے پر خواجہ حسن نظامی کی رائے سید نظیر حسن سخاؔ دہلوی کا مقدمہ اور امجد حیدرآبادی کی تقریظ جذب کی رباعیات کو استناد و اعتبار عطا کرنے کے لیے کافی ہے۔ خواجہ حسن نظامی جذب کی رباعیات پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''ایک فلاسفر برہمن کی طرح انھوں نے جذبات حیات کی تصویر دکھائی ہے''۔ جذب کے استاد سید نظیر حسن سخا دہلوی نے جذب کی قدرت زبان، صفائی بیان اور اخلاقی شاعری کے میلان کی اس طرح تحسین کی ہے:

''زبان اصلی (مادری) کنڑی اور اردو بے لچک اور لغزش کے ایسی صاف اور عمدہ گفتگو نہ بے محاورہ، نہ اردو لہجے کے خلاف، سبحان اللہ۔ گرد و پیش شاعری کے لائق نہیں پھر بھی عمر بھر شعر میں منہمک رہنا یہ قدرت کا عطیہ اور اللہ کا فضل ہے''۔ آگے وہ لکھتے ہیں ''آپ مصنوعی شاعر نہیں بلکہ فطری

شاعر ہیں اور اللہ نے آپ کو روشن حافظہ دیا ہے جس میں بجائے خیالی دنیا کے اور واہیات جذبات جوانی کے اصلی دنیا کا نقشہ کھینچا ہوا ہے''۔

کتاب کی تقریظ میں امجد حیدرآبادی نے فن رباعی سے جذب کی مناسبت طبع اور منظوم ترجمے کی مہارت کو فراخدلی سے سراہتے ہوئے لکھا ہے:

''اصناف نظم میں ان کو رباعی سے خاص تناسب معلوم ہوتا ہے۔ان میں اکثر رباعیاں ہندی اور سنسکرت زبان کے ترجمے ہیں۔ترجمہ اور وہ بھی نظم میں، نظم اور وہ بھی رباعی کی مرتعش بحر میں، کوئی آسان کام نہیں۔تاہم جذب صاحب نے امکان بھر اچھی کوشش کی ہے اور ہندی اور سنسکرت کو اردو کا جامہ پہنانے میں ایک حد تک کامیاب ہوئے ہیں''۔

ارمغان جذب: یہ جذب کی رباعیات کا حصہ دوم ہے جو خواجہ حمید الدین شاہد کے زیر اہتمام سلسلہ مطبوعات ادارہ ادبیات اردو (حیدرآباد) کے تحت 1939ء میں شائع ہوا۔یہ مجموعہ جذب کی ایک سو رباعیات پر مشتمل ہے۔جذبؔ نے اپنی رباعیات میں سادہ و سلیس زبان استعمال کی ہے۔ان میں الفاظ کی رنگینی اور خیال کی نزاکت سے زیادہ مقصدیت یعنی زندگی کے حقائق، حکمت و بصیرت اور اخلاقی اصولوں کی ترسیل و تبلیغ پر زور دیا گیا ہے۔جذب کی رباعیوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے ماہر القادری رقم طراز ہیں: ''جذب صاحب کی رباعیوں کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی اور سلاست ہے، خیالات سلجھے ہوئے طرز بیان اس قدر سادہ اور بے تکلف کہ معمولی سمجھ کا انسان بھی سمجھ لے۔جذب صاحب کی رباعیوں میں آپ خیامؔ کی مستی اور سرمدؔ کا جذب تلاش کرنے کی بے سود کوشش نہ فرمائیں۔جذب کی رباعیاں خالص اخلاقی اور ناصحانہ ہیں''۔(ارمغان جذب، مقدمہ، ص10)

صد پارۂ جذب: یہ جذب کی رباعیات کا حصہ سوم ہے جو 1964ء میں منظر عام پر آیا۔جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے یہ جذب کی سو رباعیات پر مشتمل ہے۔علمی وادبی حلقوں میں اس مجموعہ کلام کی بڑی پذیرائی ہوئی۔روزنامہ سیاست حیدرآباد، صدق لکھنؤ، رسالہ سب رس حیدرآباد وغیرہ میں اس پر تبصرے شائع ہوئے۔

مختلف علمائے ادب نے جذب کے اس مجموعہ رباعیات پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا جن میں مولانا عبدالماجد دریابادی اور منشی منور لکھنوی کے علاوہ آل احمد سرور، نور الحسن ہاشمی اور احتشام حسین جیسے نقاد شامل ہیں۔مولانا دریابادی نے ان رباعیات میں حضرت امجد حیدرآبادی کا رنگ دیکھا تو منور لکھنوی نے مشاقی سخن اور خیالات کی بلندی و رفعت کو سراہا۔آل احمد سرور نے فکر کی پختگی اور چستی کی داد دی۔

تحفہ جذب: یہ جذب کی رباعیوں کا حصہ چہارم ہے جو پروفیسر سید محمد کی ترغیب پر 1969ء میں اعجاز پرنٹنگ پریس، حیدرآباد میں طبع ہو کر منظر عام پر آیا۔کتاب کا تعارف پروفیسر سید محمد کے قلم سے ہے جس میں انھوں نے اختصار کے ساتھ جذب کے فکر و فن کے روشن پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔احوال واقعی کے تحت جذب اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

''جنوبی ہند کا ایک دیہاتی برہمن ہونے کے سبب زبان کی شگفتگی اور فن کی خوبی سے مجھے کوئی سروکار نہیں، نہ اس کا اندیشہ ہے۔زبان و فن کی خامیوں کا ہونا ہی میرے لیے باعث فخر ہے۔میں محض اپنے شوق کی تکمیل میں جو کچھ کہتا ہوں اس کے پبلک میں پیش کرنے کی جرات کرتا ہوں۔یہ ایک جنون ہے اور بس''۔

آہنگ جذب: یہ جذب کی رباعیات کے حصہ پنجم اور حصہ ششم پر مشتمل حصہ پنجم کا عنوان ''محسوسات جذب'' اور حصہ ششم کا عنوان ''معلومات جذب'' ہے۔یہ کتاب 1970ء میں حیدرآباد سے شائع ہوئی۔حصہ پنجم ''محسوسات جذب'' کا پیش لفظ حسن الدین احمد (آئی۔اے۔ایس) نے لکھا ہے۔جذب کے قلم سے ''عرض مصنف'' اور پروفیسر سید محمد کی چند سطری ''تقریظ'' ہے۔یہ حصہ ایک سو چالیس رباعیات پر مشتمل ہے۔حصہ ششم کی ابتدا میں مولانا ابوالکلام آزاد کے پرائیویٹ سکریٹری محمد اجمل خاں کا خط ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ مولانا آزاد کو ''یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ باوجود مادری زبان نہ ہونے کے آپ نے اردو زبان میں ادب و شاعری کا اچھا مذاق بہم پہنچایا اور اس کی خدمت میں سرگرم رہے''۔تعارف میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے جذب کی رباعیات کو اس طرح داد و تحسین سے نوازا ہے: ''جذب صاحب کی رباعیوں کو میں نے الٹ پلٹ کر دیکھا اور ان کی معلوم نہیں کی تکرار نے جا بجا خوب مزہ دیا..........ان کا یہ تجاہل ہے صحیح معنی میں عارفانہ، حکمت و معرفت کا درس دینے والا ہے، مجاز ہے، حقیقت تک پہنچانے والا!''

کتاب کا پیش لفظ مولانا حبیب اللہ وفا نبیرہ ذکاؔ (شاگرد غالبؔ) نے لکھا ہے۔اس حصے میں کل اکتالیس رباعیات ہیں جو ''معلوم نہیں'' کی ردیف میں

مختلف موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔ ہر رباعی اپنے مجموعی محاسن کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔ وفاؔ کے بقول ''معلوم نہیں'' کے حجاب سے معلومات کی نور افشانیاں ایک کیف نورانی کا عالم پیدا کرتے ہیں''۔

بھرتری ہری نیتی شتک: رباعیات کا یہ مجموعہ سنسکرت کے مشہور عالم، شاعر، مفکر اور مصلح بھرتری ہری کے اشلوکوں کے منظوم اردو ترجے پر مبنی ہے۔ اس مجموعے میں ہر صفحے پر پہلے بھرتری ہری کا اصل سنسکرت اشلوک درج کیا گیا ہے۔ اس کے نیچے اس کا مستند تلگو ترجمہ اور اس کے بعد منظوم اردو ترجمہ جو کہیں دو، کہیں تین اور کہیں چار اشعار پر مشتمل ہے۔ جذبؔ سنسکرت پر عبور رکھتے تھے انھوں نے بھرتری ہری کے ناصحانہ اشلوکوں کا راست سنسکرت سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ کتاب کا پیش لفظ جناب ڈی۔ راما نج راؤ (سکریٹری آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی) اور مقدمہ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ لکچرار اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی نے لکھا۔ کتاب پر تقریظ پنڈت گنڈے راؤ صاحب (واچسپتی) ناظم سیشن کورٹ سمستان گدوال نے تحریر کی ہے۔ جذب نے یہ ترجمہ اہل اردو کو سنسکرت کے بلند پایہ شاعر اور فلسفی بھر تری ہری کے افکار و خیالات اور خرد افروز کلام سے بہرہ ور کرنے کے لیے کیا۔ یہ کتاب آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔

دبستان تخیلات: سُمتی شتکمو (Sumati Shatakamu) تلگو زبان کا نہایت مشہور و مقبول شتک ہے۔ اس کا خالق بدّناؔ (Beddanna) یا بھدرا گو پال نامی شاعر تھا جس نے 1220 تا 1280 کے درمیان یہ شتک تصنیف کیا۔ اس میں روز مرہ کی زندگی کے اچھے برے تجربات و مشاہدات اور عقل و دانش کی باتیں چار چار مصرعوں کے بند کی شکل میں پیش کی گئی ہیں۔ شتک میں اس طرح کے سو بند ہوتے ہیں۔ جذب نے سمتی شتک کا اردو ترجمہ شعری پیکر میں کیا ہے۔ انھوں نے اس منظوم اردو ترجمے کا نام ''دبستان تخیلات'' رکھا جو اس کا تاریخی نام ہے۔ یہ مجموعہ 1966ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔ اس کا پیش لفظ جناب بورگل رام کرشنا راؤ نے تحریر کیا جو سابق حیدرآباد اسٹیٹ کے پہلے منتخب وزیر اعلیٰ اور سابق گورنر کیرالا اور اتر پردیش تھے۔

جذب (عالپوری) کے سو شعر: اس کتاب کو مرزا سیمابی عالپوری نے پیش کیا ہے۔ اس کے ترتیب پانے کا ماجرا یوں ہے کہ جذب کی غزلیات، اردو کے پانچ علما و مشاہیر کو بھیجی گئیں اور ان سے درخواست کی گئی کہ مرسلہ کلام سے جذب کے بیس اشعار کا انتخاب کریں جو انھیں سب سے اچھے معلوم ہوں اور ساتھ ہی ان اشعار کی تشریح بھی قلم بند کریں۔ یہ پانچ ادبا پنڈت دتاتریہ کیفی، سیمابؔ اکبرآبادی، حبیب اللہ وفاؔ، تمکین کاظمی اور بشیشور پرشاد منور لکھنوی تھے۔ ان حضرات کو الگ الگ غزلیات ارسال کی گئی تھیں۔ انھوں نے ان غزلیات سے اپنی پسند کے بیس بہترین اشعار کا انتخاب کیا اور ان کی شرح بھی لکھی۔ اشعار کے بارے میں مذکورہ اہل قلم کی رائے، ان کے منتخب کردہ بیس اشعار اور ان کی تشریحات کو یکجا کر کے زیر تبصرہ کتاب کی شکل میں شائع کیا گیا۔ اس میں مرزا سیمابی کا مختصر افتتاحیہ اور مولانا عبدالماجد دریابادی کا مقدمہ شامل ہے۔

جوہر تمثیلات: جذب کا یہ شعری مجموعہ 1937ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کی رباعیات میں جذب نے سنسکرت زبان کی ضرب الامثال کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ زمانہ قدیم میں سنسکرت زبان کی جو ضرب الامثال ہندوستان میں رائج تھیں ان میں سے سو ضرب الامثال کا انتخاب کو سم دیّو نامی کسی دانا نے کیا تھا۔ اس نے اس مجموعے کو ''درشٹانت شتک'' کا نام دیا تھا۔ جوہر تمثیلات اسی شتک کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ اس مجموعے کا مقدمہ پنڈت امرناتھ مدن ساحر دہلوی نے لکھا ہے۔ علامہ کیفی نے اس مجموعے کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا ہے۔ ''راگھویندر راؤ صاحب جذب یہ نہایت مستحسن کام کر رہے ہیں کہ سنسکرت ادب کے بعض جواہرات سے اردو کے خزانے میں ایزادی کر رہے ہیں۔ درشٹانت شتک کا اردو نظم میں نہایت نفیس ترجمہ آپ نے شائع کیا ہے جو ہر طرح سے داد کے قابل ہے۔ تمثیل کے پیرائے میں بہت سے اخلاقی سبق سکھائے ہیں۔ اور نفسیاتی نکات پر روشنی ڈالی ہے''۔ (جوہر تمثیلات ،ص 111)

مندرجہ بالا کتب کے علاوہ جذب نے سنسکرت کی کچھ اور کنڑی کی ایک کتاب کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا۔ ذیل میں ان کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔

مکالمہ بے نظیر: یہ جگت گرو شری شنکر اچاریہ کی تصنیف ''پرشنوترائن'' کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ یہ سوال و جواب کے پیرائے میں ہے۔ اس کا موضوع اخلاق و عرفان ہے۔ جذب نے اسے اردو میں منتقل کیا۔

جہالت نامہ: یہ بھی سنسکرت کی ایک اہم کتاب مورکھ شتکھ کا اردو ترجمہ ہے۔

ادراکات مرغوب: یہ معروف کنڑ اشاعر سومیشور شتکھ کا منظوم اردو ترجمہ ہے جو 1975ء میں شائع ہوا۔

نثری دھرم پرکاش: یہ سنسکرت نثر کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔(بحوالہ ڈاکٹر نادر المسدوسی عکس محبوب نگر،ص 197-196)

جذب کی دیگر تصانیف میں ساز غزل (مجموعہ غزلیات)، مکتوبات جذب (حصہ اول و دوم)، میخانہ مرغوب (تذکرہ شعرائے جنوبی) شامل ہیں۔ مالک رام اطلاع دیتے ہیں کہ جذب نے ''خم خانہ کہن'' کے نام سے جنوبی ہند (مدراس ومیسور) کے شعرا کا بھی تذکرہ لکھا تھا جو 1371ف میں مکمل ہوا۔''خم خانہ کہن'' اس کا تاریخی نامی ہے۔لیکن یہ غیر مطبوعہ ہے۔معلوم نہیں اب کس کے پاس ہے۔(تذکرہ معاصرین، جلد دوم،ص 195)

جذبؔ نے اپنی ساری زندگی، ساری خداداد صلاحیت اردو زبان اور اس کے شعر و ادب کی خدمت میں صرف کی۔انھوں نے حضرت امجدؔ کی طرح خاص طور پر رباعی کو اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ان کے کلام کے کلاسیکی انداز اور زبان و بیان کی پختگی کو سراہتے ہوئے احتشام حسین لکھتے ہیں:''عمر نے اظہار بیان ہی میں نہیں خیالات میں بھی گہرائی اور بلندی پیدا کردی ہے۔اردو آپ کی زبان ہے۔ برہمن ہونا اس میں کیسے مانع ہوگا۔ میں تو کہوں گا کہ برہمن ہونے نے خیالات میں پاکیزگی پیدا کردی ہے جسے آپ نے صاف ستھری زبان میں سچائی سے ادا کردیا ہے۔اس میں نہ تصنع ہے نہ بناوٹ''۔(بحوالہ جذب، عالپوری کے سوشعر،ص 112)

جذبؔ کے کلام میں حکمت و اخلاق کے موضوعات کے ساتھ وحدت الوجود کا نقطہ نظر بھی حاوی نظر آتا ہے۔ان کی رباعیات کے صوفیانہ رنگ کی داد مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس طرح دی ہے۔''حضرت جذبؔ برائے نام تو مجسم جذبؔ ہیں لیکن رنگ کلام کہہ رہا ہے کہ کچھ نہ کچھ سیر عالم سلوک کی بھی کیے ہوئے ہیں۔ایسی ہستیوں کا دم ملک بھر کے لیے غنیمت ہے''۔(جذبؔ، عالپوری کے سو شعر، مقدمہ،ص 5)

جذبؔ دکن کے غیر مسلم اردو شعرا میں ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ان کا نام اردو کے سیکولر کردار اور گنگا جمنی تہذیب کا استعارہ ہے۔انھوں نے صلہ و ستایش کی پرواہ اور نام و نمود کی چاہ کے بغیر اردو زبان و ادب کی خاموش خدمت کی۔ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ''آل آندھرا اردو مجلس'' نے انھیں ''خیام آندھرا'' اور ''انجمن خیال'' حیدرآباد نے ''مسیح رباعی'' کا خطاب عطا کیا۔حکومت کی جانب سے انھیں ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ادبی وظیفہ منظور کیا گیا۔ذیل میں جذبؔ کی کچھ رباعیات پیش کی گئی ہیں۔

کرجاتی ہے تاثیر بروں کی صحبت — یعنی کہ بگڑ جاتی ہے اچھی خصلت
ملتے ہی سمندر میں وہ کھاری ہوگا — گنگا کا وہ پانی جو ہے میٹھا شربت

ooo

جس میں من وتو نہو وہ من پیدا کر — اقوام کا خادم ہو وہ تن پیدا کر
وہ شمع جلا کہ جو کبھی بجھ نہ سکے — جس کو نہ خزاں ہو وہ چمن پیدا کر

ooo

سچے دل سے حرم کا دیوانہ ہوں — اور شام و سحر غلام بت خانہ ہوں
تفریق کروں دیر و حرم میں کیوں کر — دونوں شمعوں کا جذبؔ دیوانہ ہوں

☆☆☆

پروفیسر محمد نسیم الدین فریس
سابق صدر شعبہ اُردو' مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
گچی باؤلی' حیدرآباد۔032 500 (تلنگانہ)
موبائل : 9490784290

گوپال مِتل ۔ ذات وصفات

''تحریک'' کے روحِ رواں جناب گوپال مِتل پر ان کے فرزندار جمند جناب پریم گوپال مِتل نے یہ ایک جامع کتاب شائع کی ہے جوآں جہانی کی ذات وصفات کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔

یوں تو اس کتاب میں کئی مشاہیر کے مضامین ہیں مگر دیوندر ستیارتھی ،جگن ناتھ آزاد ،رشید حسن خان ،ش ۔ک ۔ نظام ،حامداللہ ندوی اوران کے ہم کار وہم مشرب مخمورسعیدی کے تاثرات گوپال مِتل کی شخصیت کو سمجھنے میں مددگار ہیں۔ پریم گوپال نے اپنے پتا جی کو جوخراجِ عقیدت پیش کیا ہے وہ بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

رشید حسن خان نے جناب گوپال متل کی نثر کی تعریف کرتے ہوئے ان کی کتاب ''لاہور کا جو ذکر کیا'' سے کئی مثالیں دیں جن سے گوپال متل کے صائب الرائے ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ جیسے یہ جملے:

ا۔ ہری چند اختر کی علمی وادبی صلاحیتوں کوان کی بذلہ سنجی اورلاابالی پن نے نقصان پہنچایا۔

۲۔ جو ناکام ادیب غیر مسلم ہوتے ہیں انھیں اپنی ناکامی میں مسلمانوں کی سازش نظر آتی ہے ۔ بہ ہر حال جہاں تک ہندو شاعروں کے احساسِ مظلومی کا تعلق ہے، یہ رائیگاں نہیں گیا۔ ملک تقسیم ہوا تو ہندوستان میں اردو کی حالت ابتر ہوگئی بہ طور تلافی ان کی (ہندوؤں کی) پذیرائی شروع ہوگئی''۔

گوپال متل نے کتنی کھری اور سچی حقیقت کو واشگاف کیا۔ حکم چند، گیان چند، گوپی چند، فراق گورکھپوری، کرشن چندر، جگن ناتھ آزاد وغیرہ کو حکومتی سطح پر خوب نوازا گیا اور خود مسلمانوں نے بھی ان کی دل کھول کر پذیرائی کی ۔ یہ کشادہ دلی دونوں طرف سے دکھائی گئی۔ گیان چند نے انورالدین کی سرپرستی کی تو گوپی چند نارنگ نے ش ۔ک ۔نظام اور جینت پرمار کے ساتھ ساتھ مشتاق صدف ،ساجد رشید ، بیگ احساس اور مجتبیٰ حسین کو سرفراز فرمایا ۔اپنے زیراثر اداروں میں ان کے قدم جمائے۔ گوپی چند نارنگ نے بلاشبہ وہ اقدامات کیے جو کوئی مسلمان کر ہی نہیں سکتا تھا۔

گوپال متل نے چند گروبانیوں کا منظوم اردو ترجمہ ''سچے بول'' کے عنوان سے کیا۔ انھوں نے لکھا:

''ایک سکھ مہنت ہمارے گھر آیا کرتے تھے اور سکھ مت کے بارے میں ہمیں اچھی اچھی باتیں بتاتے تھے ۔ان کی باتوں میں دل چسپی بڑھی تو میں گردوارے بھی جانے لگا اور جو باتیں مجھے پسند آتی تھیں میں انھیں لکھ لیا کرتا تھا۔'' جیسے:

چت بولیاں تت پایئے سو بولیے پردان
پھکا بول وگھنا سن مورکھ انجان

اس کا گوپال متل نے سات اشعار میں منظوم اردو ترجمہ کرڈالا ۔ دو شعر دیکھیے:

ہر حال میں پرہیز کر اس عادت بد سے
ہر عیب سے ہے عیب برا تلخی گفتار

یہ چیز بنادیتی ہے احباب کو دشمن
حق میں ہے محبت کے یہ چلتی ہوئی تلوار

حدیث شریف میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے بدگوئی، عیب جوئی اور غیبت کے تعلق سے کہا کہ اپنے کسی بھائی کی غیبت کرنا مردار جانور کا گوشت کھانے کے برابر ہے۔ مگر قرآن وحدیث کی ایسی اخلاقی باتیں بتانے والا انھیں کوئی نہیں ملا کیونکہ گوپال متل زیادہ تر پینے کھانے والے مسلمانوں کے ہم مشرب تھے وہ بھلا انہیں کیا اچھی اچھی باتیں بتا پاتے۔ وہ خود کوسوں ان سے دور تھے۔

پریم گوپال متل نے اپنے آں جہانی پتاجی کی تگ ودو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا:

''پھر ایک خاص سکیم کے تحت جب وسیع پیمانے پر ہندوستانی بھاشاؤں میں کتابوں کی نشر واشاعت کا سلسلہ شروع ہوا تو پتاجی نے وہاں بھی رسائی حاصل کرلی... لوگوں نے جی بھر کر بڑے بڑے گھپلے کیے اور پانچ سو کتابیں چھاپ کر پانچ ہزار کے بل وصول کیے مگر اس اسکیم کی کتابیں جب مکتبہ تحریک کی سسٹر کنسرن نیشنل اکاڈمی سے شائع ہوئیں تو پوری ایمانداری سے شائع کی گئیں... وہ گھوم گھوم کر ایک روپے میں چار کتابوں کے حساب سے کتابیں فروخت بھی کرتے تھے (اگرچہ کہ وہ مفت تقسیم کرنے کے لیے ہوتی تھیں اور مفت دیں تو کتاب کوئی پڑھتا ہی نہیں)۔

گوپال متل نے اپنے معاصرین کے تعلق سے اپنے نیک جذبات کا خوش اسلوبی سے ذکر کیا ہے جیسے مولانا تاجور نجیب آبادی جو خود کو علامہ اقبال سے بہتر شاعر سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر جو بلا کے ذہین مگر کم گو شاعر تھے۔ مولانا صلاح الدین جو گوپال متل کے مربی تھے۔ تقسیم ہند کے موقع پر ان کا گھر فسادیوں نے جلا ڈالا تھا جو ہندو بستی میں تھا۔ اسرارالحق مجاز جو خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود۔ جگر مرادآبادی جو ستر سال کی عمر کو پہنچ کر بھی محض تبرک بن کر نہیں رہ گئے۔ حفیظ جالندھری جو شاہ نامۂ اسلام لکھ کر معززین کی صف میں شامل ہوگئے تھے اور اپنی کوٹھی بھی بنوالی تھی مگر کامیابی پر غرّہ نہیں کرتے تھے۔ پنڈت ہری چند اختر جو نثر میں بھی وزن قائم رکھنے کا مشورہ دیتے تھے۔ گوپال متل نے کہا کہ کرشن چندر اور اوپندر ناتھ اشک کی آمد اس بات کا اعلان تھی کہ اب ادب کے میدان میں قلندری کا دور ختم ہوا۔ کرشن چندر نے کمیونسٹ پارٹی کے خلاف قدم اٹھایا تھا پھر اسی پارٹی سے جا ملے تاکہ پذیرائی ہو وہ بغاوت کے ذریعے اپنی قدر و قیمت بڑھانا چاہتے تھے۔ ساحر لدھیانوی بھی پروپیگنڈے کا فن خوب جانتے تھے۔ اپنا پہلا مجموعہ ''تلخیاں'' صرف ڈھائی سو کی تعداد میں پہلے چھاپ کر دوستوں میں تقسیم کردیا یوں دوسرا ایڈیشن چھاپ کر اپنی مقبولیت کا چکر چلایا۔ مخمور سعیدی جیسے ہم مشرب کی بھی تعریف گوپال متل نے کی۔

گوپال متل کے بیشتر فقرے ان کی حق گوئی و بے باکی کے غماز ہیں۔ ماہ نامہ ''تحریک'' کے شمارے ان کے ادب پاروں سے بھرے پڑے ہیں۔ وہ کمیونزم کے خلاف تھے اس لیے ان پر امریکہ نوازی کا الزام لگایا جاتا تھا۔

گوپال متل نے شاعری سنجیدگی سے نہیں کی پھر بھی جتنا کچھ سرمایہ چھوڑا اس میں ایسے کئی شعر ہیں جو ضرب المثل کی

طرح مشہور ہیں جیسے:

مجھے زندگی کی دعا دینے والے
ہنسی آرہی ہے تری سادگی پر

اور کس کو ہو مرے زہر کی تاب
اپنے ہی آپ کو ڈستاہوں میں

خدا یا ناخدا اب جس کو چاہو بخش دو عزت
حقیقت میں تو کشتی اتفاقاً بچ گئی اپنی

بہت جی چاہتا ہے یہ فقط نقصِ بصارت ہو
بڑی سرعت سے دنیا کھورہی ہے دل کشی اپنی

سلیم احمد کی مشہور زمانہ غزل کا ایک شعر بے پناہ مقبولیت پا گیا

شاید کوئی بندۂ خدا آئے
صحرا میں اذان دے رہاہوں

گوپال متل نے اپنے شعری مجموعے کا نام ''صحرا میں اذان'' رکھا اوراسی زمین میں بعض اچھے شعر بھی نکالے جیسے:

مصرف کے بغیر جل رہا ہوں
میں سونے مکان کا دیا ہوں

اے اہلِ کرم نہیں میں سائل
رستے پہ یوں ہی کھڑا ہوا ہوں

منصور نہ دعوی اناالحق
سولی پر مگر لٹک رہا ہوں

اب شکوۂ سنگ و خشت کیسا
جب تیری گلی میں آگیا ہوں

پریم گوپال متل قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اپنے آں جہانی بتاجی کے چھوڑے ہوئے نظم ونثر کے سرمائے کو کتابی شکل دے کر اسے بے نام ونشاں ہونے سے بچالیا اور موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی کے زیر اہتمام روایتی معیاری انداز میں شائع کیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر رؤف خیر
موتی محل، گولکنڈہ
حیدرآباد۔500008 (تلنگانہ)
موبائل: 09440945645

زبان سے معاف کرنے میں وقت نہیں لگتا مگر دل سے معاف کرنے میں عمریں بیت جاتیں ہیں
ذرا سوچ سمجھ کے زبان کا استعمال کیا کریں، دل کی عدالت سے ہر کوئی اتنی جلدی باعزت بری نہیں ہوتا

پنڈت دیا شنکر نسیم

اَدبیاتِ فارسی میں جو مقام چندر بھان برہمن کا ہے، اُردو اَدب میں وہی مقام پنڈت دیا شنکر نسیم کا ہے۔ پنڈت دیا شنکر نسیم ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کے آباو اَجداد کشمیری برہمن لیکن ایک مدت سے لکھنو میں مقیم تھے۔ نسیم کی پیدائش لکھنو میں ہوئی اور وہیں اُن کی پرورش و پرداخت بھی ہوئی۔ اُن کے والد کا نام پنڈت گنگا پرشاد کول تھا۔ چکبست نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا کہ نسیم کشمیریوں کی طرح بہت خوب صورت نہ تھے:

''پستہ قامت گندمی رنگ سیاہ چشم اور چھریرے بدن کے آدمی تھے۔'' (دیباچہ ''گلزارِ نسیم''۔ چکبست)

لیکن اس مختصر سراپا کے الفاظ سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ نسیم قبول صورت تھے۔ علم و فن کے مرکز لکھنو میں پیدا ہونے کی وجہ سے اُردو اور فارسی کی تعلیم ملی۔ شعرائے اُردو کے کلام سے واقفیت ہوئی۔ مزاج میں بچپن ہی سے شعر و شاعری سے لگاؤ تھا اور پھر لکھنو کی ادبی صحبتوں نے قندِ مکرر کا کام کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب آتش اور ناسخ نے لکھنو میں ایک خاص ادبی فضا قائم کر دی تھی۔ بہ حیثیت شاعر نسیم، خواجہ حیدر علی آتش سے اِصلاح لیتے تھے۔ اور بہت جلد نوعمری میں اچھے خاصے شاعر ہو گئے۔ اُس وقت لکھنو میں امجد علی شاہ کا دور دورہ تھا اور نسیم یہاں شاہی فوج میں بخشی گری کے عہدے پر مامور تھے۔

مثنوی ''گلزارِ نسیم'' ۱۲۵۴ ہجری میں مکمل ہوئی۔ کہتے ہیں اُس وقت نسیم کی عمر ۲۵ برس کی تھی اور مصنف نے خود ہی تاریخ کہی ہے:

این نامہ کہ خامہ کرد بنیاد
''گلزارِ نسیم'' نام نہاد
بشنید و نوید ہاتفے داد
توفیق قبول 'روزِیش' باد

۱۲۵۴ ہجری

نسیم نے اپنے اُستاد آتش سے اِصلاح لینے کے بعد ''گلزارِ نسیم'' کا کچھ حصہ ایک مشاعرے میں پیش کیا، جس میں لکھنو کے مشہور شعراء موجود تھے اور سبھی نے اسے پسندیدہ نظروں سے دیکھا اور دل کھول کر داد دی۔ اِس طرح اُن کی شہرت بڑھنے لگی، مصنف نے مناسب سمجھا کہ اِسے چھپوا دیں۔ چناں چہ چھ برس بعد یہ مثنوی ۱۲۶۰ ہجری میں شائع ہوئی اور خود مصنف نے اِس کی تاریخ اشاعت نظم کی:

چوں زیورِ طبع نیک پوشید
بہر تاریخ طبع کوشید
گلزارِ نسیم شد چو مسموع
گل گفت کہ تازہ گشت مطبوع

۱۲۶۰ ہجری

مگر افسوس کہ انگریزی کے شاعر جان کیٹس (John Keates) کی طرح نسیم کی عمر نے بھی اُن سے وفا نہ کی۔ ''گلزارِ نسیم'' کو طبع ہوئے ایک برس ہی گزرا تھا کہ عین عالمِ شباب میں نسیم کی باغِ جوانی پر اوس پڑ گئی۔ ہیضہ کی بیماری نے دفعتاً خاتمہ کر دیا۔ ۱۸۴۴ء میں تقریباً بتیس سال کی عمر میں نسیم نے وفات پائی اور اپنے ہی اِس شعر کی طرح خود مصداق ہوئے۔

مضامین

روحِ رواں وجسم کی صورت میں کیا کہوں
جھونکا ہوا کا تھا اِدھر آیا اُدھر گیا

چکبستؔ نے نسیم کی وفات سے متعلق ایک روایت میں لکھا ہے کہ امجد علی شاہ کے سامنے ایک طوائف نسیم کی یہ غزل گا رہی تھی:

جب نہ جیتے جی مرے کام آئے گی
کیا یہ دنیا عاقبت بخشائے گی

گاتے ہوئے جب غزل کے مقطع پر پہنچی، مقطع ملاحظہ ہو:

جاں نکل جائے گی تن سے اَے نسیم
گل کو بوئے گل ہوا بتلائے گی

اَمجد علی شاہ نے پوچھا کہ یہ غزل اُسی نسیم کی ہے جس نے ''گلزارِ نسیم'' تصنیف کی ہے؟ طوائف نے اَثبات میں جواب دیا، تو فرمایا کہ اُسے دربار میں حاضر کرو۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ حضور! اُس کا تو انتقال ہوگیا۔ نسیم کی شاعرانہ صلاحیتوں کے بارے میں چکبستؔ نے متعدد روایتیں لکھی ہیں۔

◆

گلزارِ نسیم کی اصل کہانی اس طرح شروع ہوتی ہے کہ مشرق میں ایک بادشاہ سلطان زین الملوک رہتا تھا جس کے چار بیٹے تھے؛ دانا، عاقل، ذکی اور خردمند۔ پانچواں بیٹا (تاج الملوک) پیدا ہوتے ہی نجومیوں نے بتایا کہ اس بیٹے کو دیکھتے ہی باپ کے آنکھوں کی بینائی چلی جائے گی تو باپ کی نظروں سے گر گیا۔ اُس کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں باپ نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔

پیارا وہ ہے کہ دیکھ اِسی کو
پھر نہ دیکھ سکے گا کسی کو

نظروں سے گرا وہ طفلِ ابتر
مانند سرشک دیدۂ تر
تھا افسر خسرواں وہ گلفام
پالا تاج الملوک رکھ نام
آتا تھا شکار گاہ سے شاہ
نظارہ کیا پسر کا ناگاہ
صاد آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی
بینائی کے چہرے پر نظر کی

جیسے ہی شہزادہ (تاج الملوک) پر بادشاہ کی نظر پڑی اُس کی بینائی ختم ہوتی گئی، اَب بینائی کو واپس لانے کے لیے بتایا گیا کہ ''گل بکاولی'' ہی اس کا علاج ہے۔

تاج الملوک انتہا سے زیادہ فرماں بردار، ذہین اور ذمہ دار شخصیت کا مالک ہے۔ فرض شناسی کے احساس کی بنا پر وہ گل بکاولی کی تلاش میں ازخود روانہ ہوتا ہے۔ قمار بازی اس کا شوق نہیں ہے لیکن اس میں مہارت حاصل کرتا ہے۔ یہاں کسی کے مکروفریب کے جھانسے میں نہیں آتا اور دلبر بیسوا کو شکست دیتا ہے۔ باغِ ارم کے ڈانڈے پر جب دیو سے مڈبھیڑ ہوتی ہے تو وہاں بھی عقل و خرد سے کام لیتا ہے۔ محمودا (حمّالہ دیونی کی لے پالک بیٹی ہے جو آدم زاد تھی مگر حمّالہ دم کر کے اپنے قبیل میں لے آئی تھی) کے معاملے میں بھی بڑی ہوشیاری دِکھاتا ہے۔ پھول لاتا ہے لیکن باپ تک خود نہیں پہنچا سکتا۔

گلزارِ نسیم میں کردار بہت زیادہ ہیں اور شبوت میں بہت سے نام گناتے چلے گئے ہیں۔ لیکن امتیازی خصوصیت صرف دو کرداروں کو حاصل ہے۔ تاج الملوک اور بکاولی۔ اوّل الذکر اہم ترین کردار ہے۔ اس کے اردگرد قصہ کے سارے واقعات

گھومتے ہیں اوراس قصے میں جتنے مسائل سامنے آتے ہیں اُن کا حل اسی کی ذات سے وابستہ ہے ۔اس کی شکل وصورت کے بارے میں صرف ایک شعر ہے:

وہ نور کہ صدقے مہرِ انور
وہ رخ کہ نہ ٹھہرے آنکھ جس پر

تاج الملوک دوسروں کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ایسے واقعات جن سے وہ خدمتِ خلق کے فرائض انجام دیتا ہے ۔اُس کا کردار منفرد اور معیاری ہے جو عموماً اس طبقے میں نہیں ملتا۔اُس کے چاروں بھائی اُس زمانے کے شہزادوں کی بے راہ روی کی نمائندگی کرتے ہیں اور سب کے سب ضمنی ہیں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ دوسرا جاندار کردار بکاولی کا ہے ۔اس کی پہلی جھلک ملاحظہ ہو۔

پردہ جو حجاب سا اُٹھایا
آرام میں اُس پری کو پایا
بند اُس کی وہ چشمِ نرگسی تھی
چھاتی کچھ کچھ کھلی ہوئی تھی
سمٹی تھی جو محرم اُس قمر کی
برجوں پہ ہے چاندنی تھی سر کی
لپٹے جو تھے بال کروٹوں میں
بل کھا گئی تھی کمر لٹوں میں

اس کے جاگنے اور بولنے کی تصویر چند اشعار میں ملتی ہے۔

اُٹھی نکہت سی فرشِ گل سے
منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی
پُر آب وہ چشمِ حوض پائی
دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے
کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل
جھنجھلائی کہ کون دے گیا جُل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون
ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
ہاتھ اُس پہ اگر پڑا نہیں ہے
بو ہوکے تو پھول اُڑا نہیں ہے

اِن اشعار سے اُس کی شکل وصورت اور گفتارِ ذہن سامنے آتی ہے ان میں پُر تکلف مصرعے بھی ہیں لیکن زیادہ تر نیچرل شاعری کے نمونے ہیں۔

مثنوی میں زمان ومکان کا عنصر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ گلزارنسیم میں بعض مناظر جواس مثنوی میں ہیں وہ مختصر ہونے کے باوجود لطف سے خالی نہیں ہیں ۔ مثلاً تاج الملوک گلِ بکاولی حاصل کرنے کے بعد بارہ دری کی طرف بڑھتا ہے، یہ منظر کشی ہماری عقل وفہم سے بالا تر نہیں ہیں۔ بارہ دری کا نقشہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا بادشاہوں کے محلات ہوا کرتے ہیں ۔یہ جزیات نگاری کی اعلیٰ مثال ہے

نسیم کا ایک اور امتیازی وصف یہ ہے کہ جو جو مقامات اِس مثنوی میں پیش آئے ہیں ان کے مناظر میں سحر وطلسم، جنات و پری کے عجائب وغرائب کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ جب تاج الملوک کی شادی بکاولی سے ہوتی ہے توایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شادی اور دعوت بالکل انسانوں کی سی ہے یا اُس زمانے کی رسم کے مطابق ہورہی ہے ۔

پنڈت دیاشنکرنسیم کی معرکتہ الآرا مثنوی ''گلزارِنسیم'' کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس قصہ کا ایک منظم پلاٹ ہے ۔ چند

واضح کردار ہیں۔اس کے ہیرو میں جواں مردی، ہمت واستقلال کے جوہر ہیں۔ ہر موقع پر وہ عقل وخرد سے کام لیتا ہے۔مسائل کی گتھیوں کو سلجھاتا ہے۔قصہ میں کش مکش اور (Suspense) ہے۔اس کی ابتداء اور انتہا اپنے اپنے محل پر ہے۔ ہیرواور دوسرے ضمنی کردار اپنے طبقہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ سماجی زندگی کے مناظر ہیں مگر دھندلے اور اُدھورے۔قصہ کا کوئی بھی حصہ بے ربط یا بیکار نہیں، ہر مسئلے کا حل قصے ہی میں مل جاتا ہے۔ دوسرے ہندستانی قصوں کی طرح اس کا اختتام بھی طربیہ ہے۔لیکن مصائب و آلام اور پریشانیوں کے مناظر بھی سامنے آتے ہیں۔ ''گلزارِنسیم'' کا مرکزی تصور نابینا کو بینا کرنا ہے جو پرانے شعارِ زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا تھا۔تاج الملوک ایسی ہی خدمت کے لیے کمربستہ نظر آتا ہے۔ جتنے اور واقعات اور معاشقے رونما ہوتے ہیں وہ سب اسی مرکزی تصور کے تابع ہیں۔

گلزارِنسیم کے اہم کرداروں میں بادشاہ سلطان زین الملوک ،اسکے چار بیٹے دانا، عاقل، ذکی اور خردمند۔اس مثنوی کے مرکزی کرداروں میں پانچواں بیٹا تاج الملوک (جو اِس مثنوی کا ہیرو ہے) اور بکاولی (ایک پری اور اس مثنوی کی ہیروئین) ہے۔دوسری طرف بیسوا، حمالہ،محمودا (حمالہ دیونی کی لے پالک بیٹی ہے جو آدم زاد ہے)، راجہ اِندر، روح افزا، بہرام وزیرزادہ اورحسن آرا کے علاوہ دیگر چھوٹے چھوٹے کردار بھی شامل ہیں۔ جو اس کہانی کو آگے بڑھانے میں مددومعاون ہیں۔

گلزارِنسیم کا پلاٹ مرکب ہے۔اس مثنوی میں ابتدا، وسط اور انتہا اپنی اپنی جگہ پر مکمل ہے۔کشمکش اور مسائل کے ساتھ قصہ بڑھتا اور پھیلتا ہے۔ بنیادی مسئلے کو حل کرنے کی جدوجہد کے درمیان دوسرے مسائل نکلتے آتے ہیں اور جب تک سارے مسئلوں کا حل سامنے نہیں آجاتا اُس وقت تک قصہ ختم نہیں ہوتا۔ مثلاً بنیادی سوال بادشاہ کی آنکھوں میں روشنی کا واپس آنا۔اس کے لیے بکاولی کا پھول درکار ہے۔اس کی تلاش میں پانچوں شہزادے نکلتے ہیں۔اپنی بدقماری کی بنا پر چار بھائی غلام ہوجاتے ہیں اور پانچواں تاج الملوک بیسوا تک کو جیت لیتا ہے۔زندگی آرام سے گزر سکتی تھی لیکن پامردی سے دولت کو ٹھکراتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔حمالہ دیونی کے پاس پہنچتا ہے وہاں بھی کام جوئی سے پرہیز کرتا ہے۔ جب پھول ملتا ہے تو دوسرا شگوفہ کھلتا ہے یعنی عشقِ بکاولی میں گرفتار ہوجاتا ہے۔لیکن فرض کی انجام دہی میں کوتاہی نہیں کرتا۔ باپ کی آنکھوں کو روشن کرنا ضروری سمجھتا ہے اور اپنے معاشقے کو بالائے طاق رکھتا ہے۔آنکھیں روشن ہوئیں تو اس کے دل کی روشنی بڑھی۔ پہلی نظر میں جس کا گھائل ہوا تھا وہ خود مائل ہوتی ہے۔اسی طرح قصہ بڑھتا ہے جب سارے مسائل حل ہوجاتے ہیں تو قصہ ختم ہوجاتا ہے۔

اُسلوب میں نسیم نے معیارِ شاعری کو اپنے ذہن میں رکھتے ہوئے گلزارِنسیم لکھی۔اس کے ہر شعر میں کوئی نہ کوئی صنعت ضرور پائی جاتی ہے۔مشکل ہی سے کوئی شعر ہوگا جس میں صناعی اور تکلف کی صورت نہ ہو، یہ سب نسیم کے کلام کی خوبی اور حسن ہے۔

•❖•

ڈاکٹر جعفر جری
صدر، شعبہء اُردو، ساتاواہنا یونیورسٹی،
کریم نگر، تلنگانہ اسٹیٹ، (انڈیا)۔
Mobile:9848269929

مضامین

کنہیالال کپور

کنہیا لال کپور (۱۹۸۰-۱۹۱۰) اردو کے صاحب طرز انشاء پرداز مزاح نگار، کالم نویس، پیروڈی نگار اور طنز نگار گزرے ہیں۔ ۲۶/جون ۱۹۱۰ء کو لائل پور (موجودہ فیصل آباد) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام شری لالہ ہری رام کپور تھا جو کہ پیشے کے اعتبار سے پٹواری تھے۔ کنہیا لال کپور نے اپنے گاؤں کے پرائمری اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر گورنمنٹ ہائی اسکول سے سیکنڈری کی تعلیم حاصل کی اور ۱۹۲۸ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کے امتحان نہ صرف فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا بلکہ پورے صوبے میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ انہوں نے ۱۹۳۲ء میں اے وی کالج سے بی اے اور ۱۹۳۴ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج لاہور سے انگریزی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ایک سال کمپوزیشن ٹیچر کی حیثیت سے نوکری کی پھر انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔ اس کے بعد وائس پرنسپل اور پھر بہ طور پرنسپل کپور نے ۱۹۷۵ء تک بچوں کو تعلیم دی۔

کنہیا لال کپور کے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۳۶ء میں پہلی تحریر ''خفقان'' سے ہوا۔ ان کے مضامین میں ان کی صحت کے بارے میں جا بجا اشارے بھرے پڑے ہیں۔ لفظ ''پاگل'' کو انہوں نے اپنے مضامین میں جابجا استعمال کیا۔ مزاح نگار مجتبیٰ حسین سے ان کی خط و کتابت رہی۔ انہوں نے کبھی اپنی زندگی کے لیے جدوجہد کی نہ اپنی زندگی کے لیے۔ انہیں اپنے پیشے سے کافی دلچسپی تھی۔ انگریزی زبان وادب سے محبت بھی آخری سانس تک رہی۔ انہیں اردو کے ہزاروں اشعار از بر تھے۔ کپور بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں ان کی تحریریوں میں سماج کی ناہمواریوں پر شدید طنز ملتا ہے۔ وہ نہایت ہی سادہ نثر لکھتے تھے تاہم لفظوں کے درمیان طنز کاری کی لہریں ملتی ہیں۔ کنہیا لال کپور کی تصانیف میں سنگ وخشت، شیشہ و تیشہ، چنگ و رباب، نوک نشتر، بال و پر، نرم گرم، گرد کارواں، دلیل سحر، گستاخیاں، نازک خیالیاں، نئے شگوفے، کلیات کنہیا لال کپور، کپور نامہ وغیرہ شامل ہیں۔ انہیں جون ۱۹۷۵ء کو غالب ایوارڈ حاصل ہوا۔ ۵ مئی ۱۹۸۰ء کو پونا میں ان کا انتقال ہوگیا اور اردو دنیا ایک منفرد مزاح نگار سے محروم ہوگئی۔

ایک مصنف کے بارے میں خود اس کی تحریر سے بھی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ کنہیا لال کپور اپنی تصنیف ''سنگ وخشت'' کے تعارف میں خود اپنی شخصیت کو بیان کرتے ہوئے ''تعارف'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''نام کنہیالال کپور۔ مگر بہت کم احباب مجھے اس نام کی رعایت سے جانتے ہیں۔ قد چھ فٹ، اہل زبان، سادہ دل و دماغ تو نہیں البتہ جسم ضرور رکھتا ہوں۔ چہرے کے نقوش میں سوائے ناک کے کوئی اور چیز ابھری ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔ مختصر یہ کہ حلیہ جناب مجاز لکھنوئی سے ملتا جلتا ہے۔ سنہ ولادت جون ۱۹۱۰ء۔ گردش فلک نے ایک جگہ چین سے بیٹھنے نہیں دیا اس لیے وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ میرا مستقل پتہ کیا ہے کیا ہوگا۔ بزرگوں کا وطن دہلی نہ لکھنو بلکہ پنجاب ہے۔ ۱۹۳۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے (انگریزی) کا امتحان پاس کیا۔ اور اسی سال ڈی اے وی کالج لاہور میں لیکچرر مقرر ہوا۔ تقسیم ہندوستان کے بعد ڈی ایم کالج موگا میں ملازمت کرلی۔ مستقبل کی خبر خدا جانے۔ اردو میں

سب سے پہلا مضمون ۱۹۳۸ء میں لکھا۔عنوان تھا ''چینی شاعری'' ادب لطیف میں شائع ہوا۔انگریزی میں بھی کبھی کبھی لکھتا ہوں۔ طرز نگارش میں مزاحیہ اور طنزیہ انداز کو ترجیح دیتا ہوں۔جن ادبا نے مجھے متاثر کیا ان کی تعداد تین ہے: پطرس، عظیم بیگ چغتائی کرشن چندر۔طبیعت ہمیشہ دروغ گوئی اور مبالغہ آمیزی کی جانب راغب رہی۔چند چیزیں مجھے سخت ناپسند ہیں۔غسل۔ورزش۔ فلسفہ۔خود فریبی۔ہمہ دانی اور جملہ اقسام کی کمینگی۔احباب کا دائرہ کافی وسیع ہے۔مجھے اپنے احباب کی چند چیزیں نہایت عزیز ہیں مثلاً کرشن چندر کا طرز نگارش' راجندر سنگھ بیدی کا خلوص اور معصومیت' اپندر ناتھ اشک کے قہقہے' دھرم پرکاش آنند کی مسکراہٹ' نریندر ناتھ سیٹھ کا جھوٹ' مولانا صلاح الدین کی تنقید' عاشق حسین بٹالوی کی گفتگو' میراجی کی زلفیں اور دیویندر ستیارتھی کی داڑھی۔

(کنہیالال کپور۔سنگ وخشت۔ص۔۷۔۸)

کنہیالال کپور اردو کے سچے پرستار تھے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اردو کو ایک عورت کے روپ میں پیش کرتے ہوئے اپنا مشہور زمانہ مضمون ''برج بانو'' تمثیلی انداز میں لکھا جس میں اردو کے ماضی اور حال کو بیان کیا گیا۔انہوں نے اپنی دیگر تحریروں میں بھی اردو کے ساتھ انصاف کی بات کی ہے۔مضمون برج بانو میں ہندوستان میں اردو کے ساتھ ہوئی ناانصافی پر طنز کرتے ہوئے کپور لکھتے ہیں:

''اب ایک اخبار فروش گلی میں آتا ہے۔اس کے ہاتھوں میں دس بارہ اردو کے مختلف روزنامے اور رسائل ہیں۔برج بانو ایک اردو روزنامہ خریدتی ہے لیکن جونہی اس کی نظر پہلی سرخی پر پڑتی ہے' اس کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے۔جلی حروف میں لکھا ہے ''برج بانو اب ہندوستان میں نہیں رہ سکے گی۔ایک لمحے کے لئے گویا اس پر بجلی سی گرتی ہے۔وہ دھم سے گرنا چاہتی ہے لیکن میں بڑھ کر اس کا دامن تھام لیتا ہوں۔دو چار منٹ ہم دونوں خاموش اور مبہوت کھڑے رہتے ہیں اس کے بعد میں اس سے کہتا ہوں ضد نہ کرو بانو تمہیں پاکستان جانا ہی ہوگا۔وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کڑک کر کہتی ہے۔میں نہیں جاؤں گی' ہرگز نہیں جاؤں گی۔لیکن حکومت نے فیصلہ کرلیا ہے کہ تم۔۔۔حکومت قانون بنا سکتی ہے لیکن عوام کے فطری رجحانات کو نہیں بدل سکتی۔جب تک ہندوستان میں قلفی والے' سکھ ڈرائیور اور چنا زور گرم بیچنے والے موجود ہیں حکومت میرا بال بھی بیکا نہیں کرسکتی''۔ خدا کی قسم بڑی ضدی ہو تم۔برج بانو تو مسکرا رہی ہے اور میں قلفی والے کے الفاظ زیر لب دہرا رہا ہوں۔لاجواب شاندار! بے نظیر۔(کنہیالال کپور۔برج بانو۔دہلی ۱۹۹۲۔ص ۹۔۱۰)

کنہیالال کپور اپنی مزاح نگاری کے محرکات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے یہ مضامین کیوں لکھے؟ اس کی دو وجوہ ہیں۔آج سے چار پانچ سال پہلے میرے چند احباب نے مجھے بنانا شروع کیا کہ آپ اردو میں مزاحیہ اور طنزیہ مضامین لکھ سکتے ہیں۔اردو ادب کی بدقسمتی سمجھئے کہ میں ان کی باتوں میں آگیا اور لکھنا شروع کردیا یہ مجھے 'بنانے والے' اصحاب کون تھے؟ لیجیے میں انہیں بے نقاب کیے دیتا ہوں: کرشن چندر' مولانا صلاح الدین چودھری نذیر احمد۔آج جب کہ یہ مضامین شائع کر رہا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ وہ اول درجے کے دروغ گو تھے۔(کنہیالال کپور۔سنگ وخشت۔ص ۱۰)

کنہیالال کپور نے اپنی ایک تصنیف ''نئے شگوفے'' میں طنز ومزاح کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

''طنز تنقید ہے صدائے احتجاج ہے دشنام یار ہے تبصرہ ہے تازیانہ ہے اس کا مقصد اصلاح ہے دوسرے کی پگڑی اچھالنا ہے اپنے احساس برتری کا مظاہرہ کرنا ہے بے ہودہ اشیا اور اشخاص کا مضحکہ اڑانا ہے۔مزاح مبالغہ ہے مشغلہ ہے مہتابی ہے انار ہے پھلجھڑی ہے اپنے آپ پر ہنسنے کا نام ہے چٹکی لینا ہے ہمدردانہ نقطہ نظر سے انسانی کمزوریوں کو بے نقاب کرنے کا فن ہے(کنہیالال کپور۔ نئے شگوفے۔دہلی ۱۹۸۸۔ص ۱۳)

بطور مزاح نگار کپور اپنی ابتدائی زندگی میں کامیاب رہے۔ان کے ابتدائی دور کا مشہور مزاحیہ مضمون ''غالب جدید شعرا کی مجلس میں'' تھا۔ کپور کے دیگر مزاحیہ مضامین میں شیخ چلی' ٹیوٹر' کامریڈ اور علامہ ظہور جیسے مضامین قابل ذکر ہیں۔کپور کی مزاح نگاری زندگی سے اخذ کردہ ہے انہوں نے اپنی تحریروں میں پطرس بخاری کے مزاح کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔

مضمون ''انکم ٹیکس والے'' میں کپور نے سرکاری ملازمین کے محکمہ انکم ٹیکس سے ڈر کو دلچسپ انداز میں واضح کیا ہے۔ کپور لکھتے ہیں:

''منکر نکیر اور محکمہ انکم ٹیکس کے انسپکٹروں میں یہی فرق نہیں کہ منکر نکیر مرنے کے بعد حساب مانگتے ہیں اور موخر الذکر مرنے سے پہلے۔ بلکہ یہ کہ منکر نکیر صرف ایک بار مانگتے ہیں اور انکم ٹیکس انسپکٹر بار بار۔نیز یہ کہ منکر نکیر گناہوں کا حساب لیتے وقت ثواب کو نظر انداز نہیں کرتے مگر انکم ٹیکس تجویز کرنے والے صرف گناہوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ثواب سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔۔ادھر مارچ کا مہینہ آیا ادھر ان کے پیام آنے شروع کہ صاحب ایک ہفتے کے اندر اندر آمدنی کا نقشہ پر کر کے دفتر بھیج دیجیے۔ ورنہ آپ پر دفعہ فلاں کے تحت مقدمہ چلایا جائے گا۔اسے کہتے ہیں مفت خوری اور سینہ زوری۔۔۔محکمہ انکم ٹیکس کے انسپکٹر اپنے آپ کو فرعون یا کم از کم ہٹلر سے کم نہیں سمجھتے۔(کنہیالال کپور۔ برج بانو۔دہلی ۱۹۹۲۔ص ۸۷۔۸۸)

کنہیالال کپور مزاحیہ نگاری کے اپنے ابتدائی دور میں کامیاب رہے۔انہوں نے اپنے مضامین میں سماج اور معاشرے کے حقیقی واقعات کو مزاح کے انداز میں پیش کیا۔ان کی مزاحیہ تحریروں میں زندگی سے انسیت جھلکتی ہے۔کنہیا لال کپور کی تحریروں میں واقعاتی انداز نمایاں ہے۔ انہوں نے مزاحیہ کرداروں کے ذریعے انسانی اقدار اور اخلاق کو پیش کیا اور اپنے خیالات کی ترویج کی ۔کنہیا لال کپور کے مزاحیہ مضامین میں انشائیوں کا رنگ پایا جاتا ہے ۔اس جانب اشارہ کرتے ہوئے نہال ناظم لکھتے ہیں:

''کنہیالال کپور کے مزاحیہ مضامین کا جائزہ لینے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ چند مضامین سے قطع نظر ان کے اکثر و بیشتر مضامین انشائیہ معلوم ہوتے ہیں۔کپور کے وہ مضامین جو مزاحیہ یا انشائیہ کہہ سکتے ہیں ان میں'' غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'ٹیوٹر' چینی شاعری'بڑے آدمی۔ریڈیو خریدا ہے۔ حالی ترقی پسندوں کی محفل میں۔کامریڈ شیخ چلی وغیرہ شامل ہیں''۔

(نہال ناظم۔کنہیالال کپور حیات وخدمات۔ص ۱۱۰۔دہلی۔۲۰۱۴۔)

کنہیالال کپور ایک اچھے اور صاحب طرز کالم نگار بھی تھے۔انہوں نے بے باک بے لاگ اور خوبصورت انداز بیان سے کالم نویسی کو وقار بخشا۔کنہیا لال کپور کا مضمون'' غالب جدید شعراء کی مجلس میں'' پیروڈی نگاری کی بھی اچھی مثال ہے۔غالب ان کے محبوب شاعر تھے۔ وہ غالب سے عقیدت واحترام رکھتے تھے۔پیروڈی نگاری میں وہ غالب کے مشہور و معروف اشعار کو اپنی

منشا کے مطابق استعمال کر لیتے تھے۔ کپور نے اس پیروڈی میں اپنے دور کے شعرا کو نام بدل کر بھی پیش کیا۔ جیسے انقلاب جہاں آبادی کو باغی غارت آبادی۔ تصدق حسین خالد کو قربان حسین خالص۔ میراجی کو ہیراجی۔ ن م راشد کو م ن راشد۔ علی سردار جعفری کو ولی سردار غافلی وغیرہ کے طور پر استعمال کیا۔ فیض کی مشہور نظم پھر کوئی آیا کی پیروڈی کپور نے اس انداز میں لکھی:

فون پھر آیا دل زار نہیں فون نہیں
سائیکل ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات اترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ
تھک گیا رات کو چلا کے چوکیدار
گل کرو دامن افسردہ کے بوسیدہ چراغ
یاد آتا ہے مجھے سرمہ دنبالہ دار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

(کنہیالال کپور۔ بہ حوالہ غالب ترقی پسند شعرا ص ۵۸)

کنہیالال کپور کے طنز و مزاح کے بارے میں نہال ناظم لکھتے ہیں:

کپور کا مشاہدہ وسیع، تخیل بے کراں اور بلیغ نکتہ رس اور مطالعہ نہایت وسیع اپنے مضامین میں وہ زندگی کے نشیب و فراز دکھاتا ہے۔ افراد کے قول و فعل میں تضاد کی بنیاد پر طنز اور مزاح کے پہلو دکھاتا ہے، اپنی عقلی کرب بازی اور لوگوں کی کم عقلی اور غائب دماغی سے لطف اندوز ہوتا ہے اور قاری کو بھی لطف اندوز کراتا ہے۔۔ وہ قاری کو زندگی کی تلخ حقیقتوں سے روشناس کراتا ہے تو قاری اس کی بے دردی پر ششدرہ جاتا ہے۔

(نہال ناظم۔ کنہیالال کپور حیات و خدمات۔ ص۔ ۱۳۰۔ ۱۳۱۔ دہلی۔ ۲۰۱۴۔)

کنہیالال کپور اردو مزاح نگاری کے اس دور سے تعلق رکھتے تھے جس میں رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری اور کرشن چندر کی تحریریں عام و خاص تھیں۔ اردو مزاح نگاری کو وہ زرین دور تھا جس میں اردو قارئین کو مزاح کی صورت میں دلچسپ تفریح کا سامان مہیا تھا۔ کپور بھی اپنے زمانے کی ناہمواریوں کی پیداوار تھے اور انہوں نے اسکے اظہار کے لیے طنز و مزا کا سہارا لیا و اردو مزاح گاری کی تاریخ میں اپنی انفرادیت قائم کی۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد ابرار الباقی
اسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو
شاتاواہانا یونیورسٹی۔ کریم نگر

مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد: ایک تہذیب کا معیار گیا آپ کے ساتھ

"میں یمین السلطنت ہوں، راجہ راجایاں مہاراجہ شاد"

پرانا شہر حیدرآباد کی پر پیچ گلیوں میں راقم الحروف اپنی بائک پر بیس تیس کلومیٹر کی رفتار سے دفتر کی سمت رواں دواں تھا کہ اچانک تالاب کٹہ کے قریب یہ آواز کانوں میں گونجی۔ گاڑی کو جوں ہی بریک لگایا ایک چھوٹی سی درگاہ کے سامنے دونوں ہاتھ آسمان کی سمت اٹھائے کچھ بڑبڑاتا ہوا ایک مجذوب نظر کے دائرے میں سمایا۔

"سرکار عالی جناب، آپ کی کچھ تعریف؟"

"پڑھے لکھے لگتے ہو، یمین السلطنت کا مطلب نہیں جانتے؟" سرخ سرخ آنکھوں سے گویا شعلے برساتے ہوئے مجذوب نے گھور کر جواب دیا۔ دل نے چاہا کہ کہا جائے: "یعنی کہ باہوبلی۔۔۔؟!" مگر مجذوب کی خوفناک سنجیدگی کو دیکھ کر حوصلہ نہ ہوا۔

"امن وامان تھا چین تھا دل کو قرار تھا:: عہدِ جنابِ شاد بھی کیا پُر بہار تھا"

تحت اللفظ میں شعر پڑھتے ہوئے مجذوب کی آنکھیں آسمانوں میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ یکایک آصف جاہی سلطنت کے حوالے سے گوگل سرچنگ کے نتائج اور اردو وکی پیڈیا کے صفحات یادداشت میں تازہ ہو گئے۔ ڈرتے ڈرتے مجذوب کو مخاطب کیا: "آپ شاید سابق ریاست حیدرآباد دکن کے صدرِ اعظم کشن پرشاد شاد کی بات کر رہے ہیں۔۔۔ یعنی کہ وہی مہاراجہ صاحب ناں جو اپنی دیوڑھی میں مشاعرے کرواتے تھے۔۔۔"

اس کے ساتھ ہی تین دہائی قبل کے ایک تمثیلی مشاعرے کا منظر آنکھوں میں گھوم گیا جو چار مینار کے دامن میں نومبر ۱۹۹۱ء کی ایک رات بپا کیا گیا تھا۔ ہماری نوجوانی کا عالم تھا، جب شہر کے مقبول عام اردو روزنامہ "سیاست" میں یہ پڑھا کہ ماہِ نومبر کی آخری رات کو ایوانِ شاد کا ایک مشاعرہ تمثیلی شکل میں پیش کیا جائے گا جس میں مہاراجہ شاد کے ساتھ جوش، فانی، جگر، امجد، یگانہ، حیرت، طباطبائی، ماہر القادری اور دیگر کے ساتھ امام الفن فصاحت جنگ جلیل بھی شرکت فرمائیں گے۔ وہ مشاعرہ آج بھی یادوں کے محل میں شاد وآباد ہے۔

"یمین السلطنت، یعنی حکومت کا سیدھا ہاتھ، رائٹ ہینڈ آف دی گورنمنٹ۔۔۔" مجذوب کی پاٹ دار آواز اور حیرت انگیز طور پر شفاف انگریزی لہجے نے حال میں واپس لا پٹخا۔ "مہاراجہ محض شاعر و نثر نگار نہیں، بلکہ سلطنت آصفیہ کے چھٹے اور ساتویں نظام کے دورِ حکمرانی میں آپ نائب تحصیلدار، وزیر فوج اور صدرِ اعظم کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ جانتے ہو کیوں اور کیسے؟"

میرے چہرے پر گویا متعدد استفہامیہ سوالات پھیل گئے۔ مجذوب کی آنکھیں حسب معمول خلاؤں میں بھٹک رہی تھیں، پھر اس کی آواز میں ڈرامائی پن آتا گیا۔ لگ رہا تھا کہ وہ کسی اور جہاں میں پہنچ چکا ہے اور پھر اس کی آواز خوابناک لہجے میں گونجنے لگی۔

"راجہ ٹوڈرمل مغل شہنشاہ اکبر کے دربار میں وزیر مال تھے جن کے ورثا نسلاً در نسلاً مغلیہ سلطنت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ رائے مول چند، ٹوڈرمل کی پانچویں پشت کے تھے اور اورنگ زیب کے بعد والے ساتویں مغل بادشاہ محمد شاہ کے دربار میں اعلیٰ عہدہ پر مامور تھے۔ محمد شاہ نے جب آصف جاہ اول کو دکن کا صوبہ دار بنا کر ۱۷۲۴ء میں دلی سے دکن کو روانہ کیا تو آصف جاہ اپنے ساتھ ساتھ رائے مول چند کو بھی دکن لے آئے تھے۔ ٹوڈرمل سے مول چند تک اور مول چند سے کشن پرشاد تک یہ سب ہندو خاندان میں ہندو والدین کی اولاد رہے ہیں جن کا تعلق لاہور کی کھتری ذات سے رہا۔ بلکہ کشن پرشاد تو فخریہ اپنی وصیت میں لکھتے ہیں: ہمارے خاندان کا سلسلہ مہاراج دھیراج رام چندر جی تک پہنچتا ہے یعنی ہم راجہ رام چندر جی کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ سورج ونشی خاندان نہ صرف سپاہی نژاد رہا ہے بلکہ سخاوت، مروت اور صداقت کے لحاظ سے ہمارا لوہا ساری دنیا میں مانا جاتا ہے۔"

مجذوب ایک ذرا سانس لینے کو رکا، پھر بولا: "مگر وائے افسوس۔ کشن پرشاد کے نانا راجہ نارائن پرشاد کو کوئی اولاد نرینہ نہ ہوئی اور انہوں نے اپنی دختر رانی جوالا بی بی اور داماد راجہ ہری کشن کے فرزند اور اپنے نواسے کشن پرشاد کو اپنا جانشین بنانے کا ارادہ کیا۔ نواسے کی بہترین تعلیم و تربیت پر لاکھوں روپیہ صرف کرتے ہوئے عربی، فارسی، اردو، سنسکرت اور انگریزی کی اسے باقاعدہ تعلیم دلائی۔ جبکہ کشن پرشاد نے گرمکھی زبان اپنی خود کی خواہش کے ناتے سیکھی کیونکہ وہ سکھوں کے عظیم موحد گرونانک کی تعلیمات سے خود کو روبرو کرنے کے آرزومند تھے۔ حیدرآباد کے مدرسہ عالیہ میں جہاں کشن پرشاد نے تعلیم پائی وہاں سالار جنگ دوم ان کے ہم جماعت تھے۔ نانا کے انتقال کے بعد نواسے نے ان کی جگہ لی تو چھٹے نظام میر محبوب علی خاں نے 'راجہ راجایان مہاراجہ' کے خطاب سے انہیں نوازا اور پھر چند ہی برس بعد وہ 'یمین السلطنت' کے لقب سے بھی سرفراز کیے گئے۔۔۔

خبر دار خبر دار۔۔۔"

یک بیک مجذوب کی آواز بھڑک گئی اور اس نے جمائی کو روکنے کے لیے اٹھتے میرے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑے عطر بیز مورچھل سے یکے بعد دیگرے کئی جھٹکے دیئے۔ میں اچانک بوکھلا گیا: "معافی چاہتا ہوں سرکار، دراصل شعر و ادب کا ذوق زیادہ رکھتا ہوں اور تاریخی حکایات کا شوق کچھ کم"۔

"وہ تاریخی حکایات نہیں، تاریخ کا نادر مطالعہ ہے جس کے ذریعے قوموں کے مدوجزر، عروج و زوال اور ترقی و انحطاط کی راہیں متعین ہوتی ہیں"۔ مجذوب کا لہجہ سرزنش بھرا تھا۔ "سالار جنگ اول کے بعد اگر ریاست حیدرآباد کو قابل و کامیاب منتظم اور عوام کا چہیتا وزیر اعظم اگر ملا تھا تو وہ مہاراجہ کشن پرشاد تھے۔ مگر کیا انہیں یونہی طشتری میں حلوہ رکھ کر پیش کیا جاتا رہا تھا؟ نہیں۔ بلکہ انہوں نے امرا کی سازشوں کا زمانہ بھی بھگتا اور انہیں اپنے عہدہ سے استعفیٰ دینے پر بھی مجبور ہونا پڑا۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۶ء تک مختلف وزیر اعظم بدلے گئے، ریاست حیدرآباد جو ہندو مسلم ایکتا کا گہوارہ تھی وہاں یک جہتی کا شیرازہ بکھر چکا تھا، رواداری کی زنجیر کی کڑیاں کھل رہی تھیں، عوام میں بے چینی کی لہر پھیلی ہوئی تھی۔ پھر حکومت برطانیہ کے مشورہ پر آصف سابع نے پورے تیرہ برس بعد دوبارہ مہاراجہ کو وزیر اعظم مقرر کرنے کا فرمان جاری کیا اور یوں مہاراجہ کا دوسرا دور ریاست بھر میں امن و امان کا حامل رہا۔ اور شاید اس لیے بھی کہ وہ صلح کل اور وسیع المشربی کے قائل رہے، مذہبی تعصب کو تنگ نظری سمجھا کیے اور تمام بندگان خدا سے یکساں محبت کا جا بجا اظہار کرتے ہوئے کہا:

نہ ہندو اور نہ مسلم نہ مومن و کافر	ہیں ایک صانع قدرت کی صورتیں ظاہر
کفر و اسلام کے جھگڑوں سے مبرا ہے شاد	یہ گرفتار ترا سب سے ہے اے یار جدا"

مجذوب کے لہجے میں گویا جلال ابھر رہا تھا۔ پھر اس نے اچانک ڈپٹ کر پوچھا: "جیب میں سکے رکھتے ہو؟" سر کی اثباتی جنبش پر اس نے آگے کہا: "کیوں؟ یہی ناں کہ راستے سے گزرتے فقرا و مساکین کی فوری حاجت روائی کی جا سکے تاکہ ان کے دل کی دعائیں ہمارے مسائل کو دور یا کم کرنے میں کام آسکیں۔ کیا کوئی جانتا ہے کہ حیدرآباد میں اس طرح کی مدد کا سلسلہ کہاں سے اور کیسے شروع ہوا؟"

مجذوب کچھ دیر تک میرے چہرے پر اپنے سوال کا جواب تلاش کرتا رہا۔ "یمین السلطنت کو 'بچوں والا مہاراج' کا خطاب دیا گیا تھا۔ کیونکہ اپنی دیوڑھی سے نکلتے اور واپس لوٹتے وقت ان کی عادت تھی کہ بھگوان کے چرنوں میں اظہار تشکر کے ساتھ ساتھ سڑک کے دونوں جانب سکے پھینکتے جاتے اور ان سکوں کی تلاش میں سرگرداں اور انہیں لوٹنے والے زیادہ تر فقراء اور بچے ہوتے۔ اوٹی کے ایک سفر میں جب مہاراجہ کو سکوں کی ایسی سخاوت سے روک دیا گیا تو وہ اپنی قیامگاہ سے باہر نہیں نکلے اور کہا: جب میں خیرات نہیں کر سکتا تو باہر کیوں جاؤں؟"

میرے ذہن میں یکا یک ایک فلمی مکالمہ تازہ ہو گیا: "میں آج بھی پھینکے ہوئے پیسے نہیں اٹھاتا"۔ لہذا ڈرتے ڈرتے عرض کیا: "سرکار، معاف کیجیے، زمانہ بدل گیا ہے، آج غریب سے غریب شخص کو بھی بند مٹھی سے خیرات دینی پڑتی ہے، ورنہ اسے انسانیت کی توہین باور کیا جاتا ہے"۔

"ہوووں۔۔۔" مجذوب کی آنکھوں میں کوئی چمک سی لہرائی۔ "یہی بات تو ان کے فرزندِ دلبند نے فرمائی تھی۔ کہا کہ اس طرح کی خیرات کی بجائے حاجت مندوں کو کام پر لگائیں جس سے ان کی گذر بسر ہو سکے اور وہ خود مکتفی بن سکیں۔ مہاراجہ تو اس تجویز پر بیانتہا خوش ہوئے اور بارہ اشرفیاں بطور انعام بیٹے کو عنایت کیں۔" یہ جان کر میرے دل میں باپ بیٹے کے لیے ستائشی جذبات بیدار ہونے لگے۔ تبھی مجذوب کا کرخت لہجہ گونجا: "اور ہاں یہ بھی سنو! بیٹے پر ایک اشرفی کا جرمانہ بھی عائد کیا گیا، کیونکہ اس نے اپنے غیر موزوں لہجے سے بزرگوں کو تنقید کا نشانہ جو بنایا تھا"۔ مجھے لگا کہ مجذوب نے گویا آج کی لاپروا نسل کے غیر مہذب اندازِ تکلم پر یخ بستہ پانی کی بوتل انڈیل دی ہو۔

"آپ نے مہاراجہ کی دیوڑھی کے مشاعروں کا ذکر نہیں کیا؟" میرے ذہن میں غلام جیلانی کے مرتب کردہ تمثیلی ڈرامہ 'ایوان شاد کا ایک مشاعرہ' کی یاد دوبارہ تازہ ہو گئی۔ مگر پتا نہیں کیوں مجذوب میری بات سن کر خفا ہو گیا۔ دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہنے لگا: "تم نے مہاراجہ کو صرف شاعر سمجھنے کی غلطی کیسے کی؟ انہوں نے تو نظم و نثر کی تقریباً تمام اصناف میں اپنی فکر اور اپنے فن کا خوب مظاہرہ کیا اور ادبی حلقوں میں خاصی شہرت حاصل کی۔ اگر فریادِ شاد اور جذباتِ شاد جیسی کتب ان کی انشائیہ نگاری کا اعلان ہیں تو مطلع خورشید، چنچل نار اور بزم خیال جیسے ناول ان کے تخلیقی وفور کا اظہار بھی۔ پھر ان کے اب تک کے شائع شدہ چودہ (۱۴) سفرنامے اور کتابی شکل میں ہی بارہ (۱۲) مقالے جن کے موضوعات الگ الگ نوعیت کے ہیں اور ہر مضمون جداگانہ تاریخی، مذہبی اور ادبی اہمیت کا حامل ہے۔"

مجھے اچانک مہاراجہ کی دو کتابیں "دسہرا" اور "ضلع جگت" یاد آئیں جن کو سائبر دنیا میں پی۔ ڈی۔ ایف شکل میں پیش کرنے کا شرف بھی مجھ ناچیز کو حاصل رہا۔ ایک بار پھر میری انگلیاں گوگل تلاش میں بھٹک گئیں۔ ڈاکٹر حبیب ضیاء کی کتاب کا قول فیصل موبائل اسکرین پر جگمگانے لگا: "حیدرآباد میں اردو کو سربلند کرنے میں جو عوامل کارفرما ہے ان میں سے زیادہ طاقتور عامل مہاراجہ کی اردو دوست اور ادب نواز شخصیت تھی۔"

پروفیسر فاطمہ بیگم کے ایک یادگار مضمون کے اقتباسات اسکرین پر اسکرول ہونے لگے جس میں انہوں نے مہاراجہ کی اردو خدمات کا بھرپور احاطہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"تقریباً سوتصانیف پرمبنی اپنے تخلیقی کارناموں کے ساتھ مہاراجہ نے باضابطہ شعروسخن کی سرپرستی شروع کی ۔'ایوانِ شاد' میں مشاعروں کا انعقادعمل میں لایا۔غیررسمی مشاعرے کم و بیش ہرروزان کے گھرپر منعقد ہوتے رہتے تھے۔حیدرآباد و بیرون حیدرآباد کے اہل قلم کی ہزاروں روپیوں سے امداد واعانت کرتے رہتے تھے۔ادبی رسائل،ادب کی ترقی میں غیرمعمولی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔مہاراجہ نے ادبی رسائل کی سرپرستی کے ذریعہ بھی گراں قدرخدمات انجام دیں۔ دبدبۂ آصفی،شوکت عثمانی،رسالہ محبوب الکلام،تزکِ عثمانیہ،گلدستہ جشن آصفیہ،رسالہ حیات سخن جیسے کئی ایک رسائل کی اعانت وسرپرستی فرمائی"۔

مجذوب نے میرے شانے پرمورچھل کاٹھوکادے کراپنی جانب متوجہ کیا:

"مہاراجہ نہ صرف مشرقی تمدن کا آخری نمونہ تھے بلکہ ان کی تحریریں بھی ان کی سیرت کا آئینہ داررہی ہیں خاص طور پرمہاراجہ کے خطوط اوربطور خاص علامہ سے ان کی خط وکتابت کا سلسلہ۔۔۔"

" کون علامہ؟" میں نے استعجابیہ انداز میں بھویں اچکائیں۔"تو کیا اب تمہارے زمانے میں کوئی دوسرا اقبال بھی پیدا ہوگیا ہے؟" مجذوب کا لہجہ طنزیہ تھا۔"ذرا نکالوتم اپنے اسی آتشیں ڈبے کواور پھیروانگلیاں اس پر۔۔۔پتا چلے گا کہ مہاراجہ اورعلامہ کی خط وکتابت کا مجموعہ۱۹۴۲ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا تھا جس میں اقبال کے نام شاد کے ۵۲ خط اورشاد کے نام اقبال کے ۴۹ خط شامل ہیں جو۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۷ء کے دوران ایک دوسرے کو لکھے گئے اور۔۔۔" مجذوب نے ایک لمبی سانس چھوڑی پھر کہا:"اوراسی کتاب کے ۳۰صفحات پرمشتمل مقدمہ میں ڈاکٹر زور نے مہاراجہ اوراقبال کے تعلقات پروضاحت سے روشنی ڈالی ہے"۔

میں نے جلدی جلدی ریختہ پرکتاب کھوجی۔تعلقات کا اظہار گویا واضح ہوکرایک خط اوراس کے جواب کے ذریعے سامنے آگیا،شاد نے اقبال کولکھا تھا:"میرے پیارے اقبال،خداتمھیں دلشاد وسلامت رکھے۔بلامبالغہ کہتا ہوں کہ جس وقت اقبال کا خط دیکھتا ہوں باچھیں کھل جاتی ہیں اوردل نہایت شاداں اورمسرور ہوجاتا ہے،اللہ کے واسطے محبت ہے،نہ کوئی غرض دنیوی نہ دین کا سوال۔"اورجواب میں اقبال لکھتے ہیں:"محبت نامہ مل گیا جس کے لیے اقبال سراپا سپاس ہے،الحمدللہ آئینہ دل گردِغرض سے پاک ہے۔اقبال کا شعار ہمیشہ سے محبت وخلوص رہاہےاورانشاءاللہ رہے گا۔ اغراض کا شائبہ خلوص کومسموم کردیتا ہے۔دل تو بہت عرصہ سے آرزومند آستانہ بوسی ہےمگرکیا کیا جائے ایک مجنوں اورسوزنجیریں"۔

" کوئی تفصیل تونہیں ملتی مہاراجہ کی وفات کے متعلق۔۔۔ایسا کیوں؟" میں نے مہاراجہ کے انتقال سے متعلق معلومات کوگوگل سرچنگ میں ڈھونڈنے کی ناکام سعی کے بعد مجذوب سے پوچھا۔

" جانا تو سب کو ہے،اِس کوبھی،اُس کوبھی تجھے بھی مجھے بھی۔جگ میں بس رہ جاتے ہیں پیارے تیرے بول۔کیا کہا تھافرحت اللہ بیگ نے یمین السلطنت کے انتقال پر؟ ذرادیکھ،دیکھ ذرا۔۔۔مجلۂ عثمانیہ کے مہاراجہ نمبر میں بیگ نے لکھا ہے:جب مہاراجہ کا انتقال ہواتو ہرقوم اورملت کے لوگ ان کی ارتھی کے ساتھ تھےاورہرشخص اپنے عقیدے کے موافق ان کے لیے دعائے مغفرت کرتا تھا،یہاں تک کہ ایک پادری صاحب انجیل پڑھتے ہوئے اس مجمع کے ساتھ مرگھٹ تک گئے۔۔۔"

"اللہ ہو،اللہ ہو،حق اللہ ہو"

اچانک مجذوب کے درویشانہ نعرے بلند ہوتے گئے اورادھرموبائل پرمیری انگلیاں اوپرنیچےحرکت کرتے ہوئے مہاراجہ کی ایک رنگین تصویرپررکیں تو دیکھا کہ اسکرین پراخلاق،سخاوت،خلوص،بیلوثی،مذہبی رواداری،انصاف پسندی،غرباپروری جیسے اقدارمہاراجہ کی تصویر سے منعکس ہوکرابھررہے تھےاوران کی تصویراشکوں سے دھندلاتی میری نگاہوں میں گویاڈوبتی جارہی تھی:

آپ کی موت تو اک دورکا مٹ جانا ہے ایک تہذیب کا معیار گیا آپ کے ساتھ
وہ شرافت،وہ صداقت،وہ محبت وہ خلوص آپ کے دورکا کردار گیا آپ کے ساتھ!

☆☆☆

مکرم نیاز

16-8-544 نیوملک پیٹ' حیدرآباد۔ 500024 (تلنگانہ)

موبائل: 7207827572

مضامین

محبّ اردو، جدید تعلیم اور حب الوطنی کا حامی کثیر جہتی شاعر: چکبست

اردو زبان کسی خاص مذہب یا جغرافیائی خطے میں مقید نہ تھی اور نہ ہے۔ یہ ہمارے ملک کے طول وعرض میں ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے' اس کی بولیاں مختلف ہیں اور انداز بیان جدا جدا۔ اس کے لکھنے پڑھنے اور بولنے والوں میں اکثریت تو مسلمانوں کی رہی ہے لیکن اس کو سبھی اقوام نے اپنایا، خوب سنوارا اور اس کی خدمت کی ہے۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے اس زبان کو اپنے لکھنے اور پڑھنے میں استعمال کیا ہے بلکہ اس کے استعمال سے اپنی کمیونٹی اور اپنے سماج کے اندر تعلیمی، سماجی بیداری اور حب الوطنی کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ ایسے ہی ایک عظیم شاعر چکبست بھی ہیں جو ایک کشمیری پنڈت اور پیشے سے وکیل ہونے کے باوجود اردو کی خدمت کرتے رہے گو کہ زندگی نے ان کا ساتھ بہت کم دیا۔ اس مضمون میں ان کی سوانح، سماجی خدمات، لڑکیوں کی تربیت، عورتوں کے حقوق، تعلیم کے متعلق ان کا نظریات، زندگی کا فلسفہ وغیرہ جیسے اہم نکات پر بحث کی گئی ہے۔ اسی لئے مقبول عام "اردو ہے میرا نام، میں خسرو کی پہیلی" نظم میں اقبال اشہر نے انکے بارے میں کیا خوب کہا ہے،

ہے "ذوق" کی عظمت کہ دیئے مجھ کو سہارے
"چکبست" کی الفت نے میرے خواب سنوارے
''فانی'' نے سجائے میری پلکوں پہ ستارے

چکبست کی سوانح: برج نرائن چکبست (1882-1926)، ایک کشمیری برہمن تھے، فیض آباد میں پیدا ہوئے لیکن اپنی زندگی کے اوائل میں لکھنؤ ہجرت کر گئے، وہاں کشمیری محلّہ میں رہنے لگے۔ انکی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ایک مولوی سے اردو اور فارسی میں ہوئی، اور بڑے ہو کر انہوں نے ان زبانوں کے کلاسیکی ادب سے بھی واقفیت حاصل کی۔ جہاں تک ان کی رسمی تعلیم کا تعلق ہے، انہوں نے 1900 میں میٹرک، 1902 میں ایف۔اے، 1905 میں بیچلر آف آرٹس، اور 1907 میں بیچلر آف لا کی ڈگریاں حاصل کیں۔

چکبست اپنے وقت کے سماجی وسیاسی حالات سے بخوبی آگاہ تھے، انہوں نے کشمیری ینگ مینز ایسوسی ایشن کی تشکیل، بہادر لائبریری کے قیام، ہوم رول پر اپنے خیالات کے اظہار کے ذریعے اس وقت کے ضروریات پر کام کیا۔ بحیثیت وکیل انہوں نے لکھنؤ بار میں شمولیت اختیار کی اور اس کے سب سے ممتاز ممبر کے طور پر ابھرے۔ ایک شاعر اور شدید سماجی وسیاسی شعور کے حامل فرد کی حیثیت سے ان کا کیریئر ان کی قبل از وقت موت کے ساتھ منقطع ہو گیا۔ چکبست کا احترام کیا جاتا ہے اور ایک قابل ذکر شخصیت کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ چکبست جنہوں نے اپنی ثقافتی شناخت کو فخر کے ساتھ برقرار رکھا وہ واقعی ایک سیکولر شخص تھے، تمام برادریوں اور عقائد کا یکساں طور پر احترام کرتے تھے، اور حالات حاضرہ پر بھی ان کی خاصی پکڑ تھی۔ انہوں نے جس قسم کی شاعری لکھی، وہ قوم پرستی کے لحاظ سے بہتر تھی۔ جہاں وہ مرزا غالب، میر انیس اور حیدر علی آتش سے بحیثیت شاعر متاثر تھے، انھوں نے گاندھی جی، اینی بیسنٹ، گوکھلے، راناڈے اور اس طرح کے دیگر لوگوں کے سیاسی اور سماجی خیالات سے بھی استفادہ کیا۔ انہوں نے اپنے شعری کیریئر کا آغاز 1894 میں ایک نظم سے کیا۔ انہوں نے نظمیں، مثنوی، ایک ڈرامہ اور تقریباً 50 غزلیں لکھیں۔ ان کا لکھا گیا رامائن کا ایک منظر میر انیس کے مرثیہ کی شدت سے یاد دلاتا ہے۔ ان کو اپنے آبائی وطن سے بے انتہا محبت تھی جس کی جھلک ان کے کشمیر پر لکھے اس شعر سے جھلکتی ہے:

ذرّہ ذرّہ ہے میرے کشمیر کا مہمان نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پینے کو پانی مجھے

صبح وطن، ان کی نظموں کا مجموعہ، جو ان کی وفات کے بعد 1926 میں شائع ہوا، اسے پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس میں انہوں نے حب الوطنی، قوم پرستی، مذہبی، اصلاحی اور سیاسی موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔ نثر اور شاعری میں ان کا کام سادگی اور بے ساختہ دونوں کے ذریعہ نشان زد ہیں جو قارئین کو فوری طور پر اپیل کرتے ہیں۔ ان کی تصنیفات یعنی شاعری اور ادبی تخلیقات کو انہوں نے مختلف مقامات اور کشمیر درپن جیسے رسالہ میں شائع

کروایا۔کلیات چکبست اور مضامین چکبست شاعری اور نثر میں چکبست کے کاموں کا مکمل مجموعہ ہے جو شاعر کی صد سالہ پیدائش پر بعد از مرگ شائع ہوا تھا، جسے کالیداس گپتا 'رضا' نے 1983 کے دوران مرتب کیا تھا۔

چکبست کی میراث: فروری 1926 میں وہ رائے بریلی کے ریلوے سٹیشن پر گر گئے اور 44 سال کی عمر میں فالج کا شکار ہو کر انتقال کر گئے۔چکبست کی قبل از وقت موت اردو کے لیے بہت بڑا نقصان تھی لیکن وہ جو کچھ چھوڑ گئے وہ مثالی ہے اور اردو ادب کے جواہر میں شمار ہوتا ہے۔اسی پس منظر میں ذکر ہے 2015 کی فلم مسان کا جو شروع ہوتی ہے تو اس میں بشیر بدر، اکبر الہ آبادی، مرزا غالب اور دشینت کمار کے کام کے ساتھ چکبست کی شاعری اور شاعری کی مختلف مثالیں شامل کی گئی ہیں۔ان کو شعوری خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فلم کے گیت کار ورون گروور نے وضاحت کی کہ شالو (شویتا ترپاٹھی کے کردار) کو ایک ایسے شخص کے طور پر دکھانا چاہتے ہیں جس کا شوق ہندی (اردو) شاعری اور شاعری پڑھنا ہے، کیونکہ یہ ہزار سالہ گنگا جمنی تہذیب کا مشترکہ ورثہ ہے اور شمالی ہندوستان کے نوجوان، خصوصی طور پر جب وہ محبت میں ہوں، تو شاعری کرتے ہیں جس پہلو کو ہندی (اردو) فلموں میں کم ہی دکھایا جاتا ہے۔

اردو کا مذہبی روایات پیش کرنے میں استعمال: بیسویں صدی میں، برج نارائن چکبست نے بھگوان رام کی کہانی کا اپنا اردو ورژن بنایا۔انہوں نے ہندومت کو اردو کے اعلیٰ ادب کے محاورں کے ذریعے ایک ایسے وقت میں بیان کرنے کو منتخب کیا جب زبان اور مذہب نے اپنے زمانے کی ہندو اور مسلم برادریوں کو الگ کر دیا تھا، جو کہ تاریخی اور ثقافتی مثال ہے۔چکبست نے بھگوان رام کی کہانی کو تین نظموں میں پیش کیا: رامائن کا ایک منظر، ماں کا جواب اور بنواس ہونے پر ایودھیا نگری کا حال۔پہلی نظم میں، رام اپنی ماں کو جنگل جانے کے لیے بادشاہت چھوڑنے کے اپنے فیصلے سے واقف کرتے ہیں، ماں کے اعتراض پر وہ اپنی دلیل پیش کرتے ہیں۔دوسری نظم میں ماں جواب دیتی ہے اور اس میں بحث کا اختتام ہوتا ہے۔اگرچہ دوسری نظم وہیں سے شروع ہوتی ہے جہاں پہلی ختم ہوتی ہے، لیکن ان میں سے ہر ایک خود مختار اکائی کے طور پر نظر آتی ہے۔پہلی دو نظمیں ماں اور بیٹے کے درمیان مکالمے پر مشتمل ہیں، لیکن تیسرے میں، ایک ماہر نثر نے سیتا اور ایودھیا کے جذبات کو جلاوطنی کا وقت قریب آنے پر دکھایا ہے۔پہلی نظم کے کچھ اقتباسات درج ہیں جس سے جہاں ان کے زبان، انداز بیان کا پتہ چلتا ہے، وہیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اردو کسی خاص مذہب کے مضامین تک محدود نہیں رہی۔

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام
راہِ وفا کی منزلِ اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام
دامن سے اشک پوچھ کے دل سے کیا کلام
اظہارِ بیکسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

سماجی خدمات: لکھنؤ میں اپنے کشمیری محلّہ کے نوجوان بچوں کے لئے انہوں نے ایک لائبریری (اردو کتب خانہ) قائم کی جس میں نادر اردو، فارسی اور کشمیری مخطوطات جمع کئے اور ان کے مطالعے کے لئے بچوں کی رہنمائی اور مشاورت کرتے رہے۔جب سماج کے کچھ افراد جیسے موہن لال کشمیری اور بشن لال نارائن ڈار (جو یوروپ سے لوٹے تھے) اپنے روایت سے منحرف ہوتے نظر آئے اور کشمیری پنڈت سماج نے ان کو خارج کیا تو انہوں نے سماجی ضرورت اور مطابقت کے لئے مضامین و نظمیں لکھیں۔ان افراد کے تناظر میں وہ کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

سیر یورپ سے یہ اخلاق و ادب سیکھا ہے
ناچنا سیکھا ہے اور لہوولعب سیکھا ہے

"مرسلہ کشمیر" نامی رسالہ سے جڑے اور اپنی تصانیف سے کشمیری پنڈت کمیونٹی میں سماجی بیداری کی مہم چلائی۔اپنے گھر کے پڑوس کے کھلے

مضامین

میدان میں وہ کل ہند مشاعروں کا انعقاد کرتے تھے، جہاں نہ صرف سماجی میل جول ہوتا بلکہ یہاں سے ان کے انقلابی خیالات بھی نوجوان نسل تک پہنچتے تھے۔انہوں نے اپنی قوم کی آنے والی نسلوں کے لئے جو درد رکھا تھا، وہ اخلاقی تعلیم کی اہمیت پر مبنی تھا،اس کو مندرجہ ذیل شعر کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے:

ادب تعلیم کا جوہر ہے زیور ہے جوانی کا
وہی شاگرد ہیں جو خدمت استاد کرتے ہیں

جس طرح تعلیم زندگی جینے کے لئے اہمیت رکھتی ہے، یہاں پر شاعر ادب کو تعلیم پر بھی فوقیت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ادب تعلیم کا جوہر ہے اور ادب ہر نوجوان کے لئے زیور کی مانند ہے، اور آگے یہ بھی کہتے ہیں کہ اچھا شاگرد (یعنی باادب شاگرد) وہی ہے جو اپنے استاد کی خدمت کرتا ہے۔

لڑکیوں کو نصیحت: لڑکیوں کی تعلیم و تربیت ان کے نزدیک اہمیت کی حامل تھی۔1917 میں انہوں نے اپنی برادری کی لڑکیوں کے لئے ایک ناصحانہ نظم "پھول مالا" کے عنوان سے کہی۔اس کے کئی اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں جہاں اپنی لڑکیوں کا خیال تھا وہیں وہ نام نہاد ترقی اور مغربی تہذیب کی نقل کے معاملات پر کیا خیالات رکھتے تھے۔

نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے
خاک میں غیرت قومی نہ ملانا ہرگز
رنگ و روغن تمہیں یوروپ کا مبارک لیکن
قوم کا نقش نہ چہرے سے مٹانا ہرگز
پوجنے کے لئے مندر ہے جو آزادی کا
اس کو تفریح کا مرکز نہ بنانا ہرگز

ادبی تخلیقات: ان کی ادبی تخلیقات میں متوازن خود سپردگی، وطنی شاعری کی مقدار، باہوش تحریک، فلسفہ زیست، منظم جوش، فلسفہ لاعلمیت اور اخلاقیات، کلاسیکی روایت، جذبات کے مرقعے، محرکانہ شاعری، تخیلاتی شاعری، سلسلہ ہائے تمثال، نثر نگاری، لکھنوی طرز، عدالتی بحث کا ڈھنگ، ڈرامہ جیسے مختلف پہلو دیکھنے میں ملتے ہیں۔

اختتام: چکبست کو حب الوطنی اور فرقہ وارانہ اتحاد کا شاعر مانا جاتا ہے۔لیکن بعض اوقات میں ان کی حب الوطنی کو اس لیے بھی ناکافی سمجھا جاتا ہے کہ وہ لبرل اور نرم دلی کا شکار تھی۔آج کے دور سے اُس گذرے دور کے ہندوستانی حالات و ضروریات کا موازنہ کرنا اور ان کی حب الوطنی پر سوال کرنا صحیح نہیں ہوگا۔چکبست نے جہاں زبان و ادب کی خدمت کی وہیں اُس دور کے حالات کے مطابق اپنے تصانیف میں انہوں نے مہاتما گاندھی اور اُس دور کے دوسرے لیڈران کے خیالات سے بھی استفادہ کیا تھے، جو قابل تعریف امر ہے۔اس مضمون میں سیاسی بحث، مذہب سے کنارہ کشی کی گئی ہے، جبکہ چکبست کے علمی، سماجی اور وطن کے تئیں خدمات کو انکی تصانیف اور افعال کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔وہ ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی ایک اہم مثال تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کو صف اول کے شعراء و ادباء میں گنا جاتا ہے۔اگر وقت نے ان کا ساتھ دیا ہوتا اور زیادہ عمر پاتے تو شاید وہ اردو ادب کی مزید خدمت کر سکتے تھے۔ ان کی کم عمری میں موت اردو دنیا کے لئے ایک ناتلافی نقصان ہے، جس کی بھرپائی ممکن نہیں۔

☆☆☆

پروفیسر مشتاق احمد آئی پٹیل
پروفیسر آف ایجوکیشن،
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد۔032 500
موبائل:9440029488

اردو کی ایک گراں مایہ شخصیت: فکر تونسوی

اردو میں طنز و مزاح کا ایک معتبر نام فکر تونسوی کا ہے۔ وہ اپنے مخصوص اسلوب اور طنز کے تیکھے طرزِ نگارش کی وجہ سے اپنی مثال آپ تھے۔ ان کے کالم مقبولیت کا ایک ریکارڈ رکھتے ہیں۔ آج بھی ان کا نام عوام و خواص میں مقبول ہے، ان کی تحریریں شوق سے پڑھی جاتی ہیں کہ فی زمانہ ان کی افادیت اور حالات سے اضافیت بہت بڑھ گئی ہے۔

فکر تونسوی کا اصل نام رام لعل بھاٹیہ ہے لیکن وہ ہمیشہ فکر تونسوی کہلانا پسند کرتے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر مظفر حنفی کو دیئے گئے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا: ''میرا اصلی نام فکر تونسوی ہے جو اصلی ہے۔ اور جو نقلی تھا وہ میرے والدین نے رکھا تھا۔ بہت سے لوگ اسی کھوج میں رہے کہ اس کا اصلی نام کیا تھا۔ کچھ لوگوں نے کھوجا بھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ انہوں نے غلط کھوج کی۔ نام کو چھوڑیے۔''

فکر تونسوی کی تاریخ پیدائش 7 / اکتوبر 1918 اور تاریخ وفات 12 / ستمبر 1987 ہے۔ غیر منقسم ہندوستان کے علاقہ پنجاب کے ایک قصبہ تونسہ شریف میں دھنپت رائے کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم تونسہ میں حاصل کی۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور کا رخ کیا۔ وہیں قیام پذیر ہو گئے۔ ان کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز لاہور ہی میں ہوا۔ چند سال بعد ہندوستان کی آزادی اور تقسیم ہند کا سانحہ پیش آیا۔ تقسیم ہند کے بعد وہ فوراً ہندوستان منتقل نہیں ہوئے۔ لیکن ایک مدت بعد حالات نے انہیں ہندوستان آنے پر مجبور کر دیا۔

فکر تونسوی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ ان کا شعری مجموعہ "ہیولے" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ابتدائی دور میں شاعری کے بعد طبعی مناسبت اور حالات کے باعث انہوں نے نثر کی جانب توجہ دی۔ انہوں نے طنز و مزاح اور ظرافت کے میدان میں طبع آزمائی کی۔ بے انتہا مقبولیت اور عوام و خواص میں پسندیدگی نے انہیں اسی میدان میں رہنے اور مستقل لکھنے پر مجبور کیا۔ انہوں نے کالم لکھے۔ طنز و مزاح کے ساتھ ان کی وابستگی تا دم آخر قائم رہی۔ وہ بنیادی طور پر ایک ترقی پسند ادیب تھے۔ انہوں نے پورے شعور کے ساتھ ترقی پسندی اور کمیونسٹ نظریات کو اختیار کیا تھا۔ تادم آخر وہ ترقی پسند نظریات سے وابستہ رہے۔ فکر تونسوی اپنے نقطۂ نظر اور طرزِ عمل میں ہمیشہ تعصب سے پاک رہے۔ تقسیم سے قبل بھی، تقسیم کے دوران بھی اور تقسیم کے بعد ہندوستان منتقل ہونے کے بعد بھی۔ تقسیم وطن کے سلسلے میں وہ مذہب کے بجائے سیاست اور مفاد پرستی کو موردِ الزام قرار دیتے تھے۔ مذہب جو سیاست دانوں اور مفاد پرستوں کے ہاتھوں کھلونا بن گیا تھا، اسی باعث فکر تونسوی مذہب بیزار ہو گئے تھے۔ فکر تونسوی کی نظر میں مذہب کے نام پر استحصال سب سے بڑا گناہ ہے۔ فکر تونسوی کی نظر میں انسانیت سب سے بڑا مذہب تھا اور وہ اسی پر گامزن رہے۔ وہ اپنے قول و فعل میں اسی کے قائل اور عامل تھے کہ انسانیت کے آفاقی اصولوں کو اختیار کرنا چاہیے اور ان پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ وہ انسان نوازی اور انسان دوستی کو انسانیت کا مقصد قرار دیتے تھے۔

فکر تونسوی کے یہاں مذہب بیزاری جو نظر آتی ہے تو اس میں الحاد نہیں ہے۔ وہ خدا کے وجود کے منکر نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں خود خدا سے مخاطب ہو کر خدا سے شکایت کی ہے۔ وہ دنیا کی بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں کا شکوہ خدا سے کرتے ہیں۔ نثر میں بھی اور شاعری میں بھی انہوں نے خدا سے خطاب کر کے اپنی شکایات درج کرائی ہیں۔

فکر تونسوی ایک زود نویس قلمکار تھے، انہوں نے اردو میں خوب لکھا۔ ان کے کالم اردو کے مقبول کالموں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے کالم ہلکے پھلکے اور سیدھے سادے ہوتے تھے لیکن ان میں طنز کی زبردست کاٹ اور حالات پر تیکھا وار ہوتا تھا۔ ان کا سیاسی طنز آج بھی قابلِ توجہ ہے بلکہ موجودہ حالات میں اس کی معنویت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ان کے کالم پرتاپ، بیسویں صدی اور دیگر اخبارات و رسائل میں پابندی سے شائع ہوتے تھے۔

فکر تونسوی نے شاعری کے علاوہ، نثر میں مضامین اور کالم لکھے۔ ابتداء میں انہوں نے ڈرامے بھی لکھے، جو شاید محفوظ نہ رہ سکے۔ انہوں نے اپنے ڈراموں کا تذکرہ کیا ہے۔ فکر تونسوی نے ناول بھی لکھا ہے لیکن اس کا اسلوب بھی طنز و مزاح سے بھرپور ہے۔ ان کے ناول کا نام 'پروفیسر بدھو' ہے۔ اسی طرح ''چوپٹ راجا'' بھی گویا ایک مزاحیہ ناول ہے۔

مضامین

فکر تونسوی کی تصانیف: ہیولے (شعری مجموعہ) چھٹا دریا، پیاز کے چھلکے، چوپٹ راجا، فکریات، بدنام کتاب، فکرنامہ، آدھا آدمی، بات میں گھات، گھر میں چور، چھلکے ہی چھلکے، فکر بانی، میری بیوی، وارنٹ گرفتاری، ماڈرن الہ دین، ماؤزے تنگ، آخری کتاب، پروفیسر بدھو، ساتواں شاستر، خدوخال، تیر نیم کش۔ وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔

اعزازات وانعامات: فکر تونسوی کو اردو دنیا میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کی ادبی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا گیا۔ ان کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں انہیں اعزازات اور انعامات سے نوازا گیا۔ 1969ء میں سویت لینڈ نہرو ایوارڈ پیش کیا گیا۔ ان کی تصنیفات پر ایوارڈ دئے گئے جن میں 1973ء میں اتر پردیش اردو اکادمی نے ''چوپٹ راجا'' پر ایوارڈ دیا۔ 1977ء میں ''فکر نامہ'' پر اتر پردیش اردو اکادمی نے ایوارڈ دیا۔ 1980ء میں ''آخری کتاب'' پر اتر پردیش اکادمی نے ایوارڈ پیش کیا۔ مغربی بنگال اردو اکیڈیمی نے 1985ء میں ''فکر بانی'' پر ایوارڈ عطا کیا۔ میر اکیڈیمی نے 1983ء میں ایوارڈ پیش کیا۔ بھاشاو بھاگ پنجاب نے 1987 میں ایوارڈ عطا کیا۔ فکر تونسوی کو 1987ء میں غالب ایوارڈ پیش کیا گیا۔ علاوہ ازیں دوردرشن کے لیے ایک پرگرام منظور ہوا تھا جس کا نام تھا ''فکر کی باتیں''۔ دوردرشن پر اس کی غالباً تیرہ قسطیں منظور ہوئی تھیں جو بجائے خود ایک اعزاز تھا۔ عوامی مقبولیت کے ساتھ ساتھ اردو کے علمی وادبی حلقوں میں فکر تونسوی کی بڑی عزت اور قدر و منزلت تھی۔ ان کی تحریروں کو آج بھی اہمیت سے پڑھا جاتا ہے، جوان کی تحریروں کی شگفتگی، شیفتگی اور دلآویزی اور مقبولیت کا ایک ریکارڈ ہے۔ لوگ پڑھتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔

فکر تونسوی کی کالم نگاری: اردو میں کالم نگاری کے سلسلے میں کئی اہم نام ملتے ہیں۔ اودھ پنچ بلکہ اس سے قبل بھی اس نوع کی روایت ملتی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کے ہمدرد، مولانا عبدالمجید سالک کے انقلاب، مجید لاہوری کے نمکدان اور حاجی لق لق کا کالم کیلے کے چھلکے۔ پھر مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے صدق، صدق جدید اور سچ کے کالموں، سچی باتوں کے علاوہ چراغ حسن حسرت کے کالم بھی اپنی جگہ ہیں۔ لیکن فکر تونسوی کی بات ہی اور ہے۔ فکر تونسوی کی کالم نگاری اردو میں اپنی نوعیت کی منفرد اور مخصوص ہے۔ اس کا اسلوب فکر ہی کی ایجاد تھا اور انہیں پر گویا ختم ہو گیا۔ کرشن چندر نے فکر تونسوی کے پیاز کے چھلکوں کے بارے میں لکھا ہے: ''فکر کے مزاح اور طنز کی کئی پرتیں ہیں۔ اسی لیے شاید اس نے اپنے فکاہیہ کالم کا نام "پیاز کے چھلکے" رکھا ہے جو شمالی ہند کے ایک روزنامہ میں بڑی باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتا ہے اور جس نے شمالی ہند کے لوگوں کی حس مزاح کی صحت اور تہذیب میں ایک بہت بڑا رول ادا کیا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ پیاز کے پہلے دو ایک چھلکے زیادہ کڑوے نہیں ہوتے، یہی حال فکر کے مزاح کا بھی ہے۔ پھر جوں جوں پیاز کے چھلکے اترتے جاتے ہیں اس کی کڑواہٹ بڑھتی جاتی ہے۔ یہی حال فکر کے طنز کا بھی ہے۔ آخری گھٹی بڑی کڑوی ہوتی ہے۔ اس قدر کہ آنکھ میں آنسو آجاتے ہیں۔ اسی طرح جب آپ فکر کے مزاح کی آخری گھٹی پر پہنچتے ہیں تو ذہن میں اس کی تلخی اپنی پوری تیزی اور تندی کے ساتھ چھا جاتی ہے۔ ''پیاز کے چھلکے'' اسم بامسمیٰ اسی کو کہتے ہیں۔''

یوسف ناظم نے ایک جگہ لکھا ہے: ''بعض لوگ پیاز کے چھلکے اور فکر تونسوی کو دو علیحدہ علیحدہ چیزیں سمجھتے ہیں۔ یہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ تنفس بھی دونوں میں۔ پیاز کے چھلکے بھی اتنے ہی جاندار ہیں جتنے کہ فکر تونسوی ہیں۔''

ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں: ''فکر صاحب کی پیاز دیوار چین کی طرح ہے ..... فکر صاحب ہر روز صبح کو پیاز کے چھلکے اتارتے ہیں لیکن پیاز رات کو پھر اتنی ہی ہو جاتی ہے۔ ابھی تک پیاز نے ہار مانی ہے اور نہ فکر نے۔ اردو کے طنزیہ ادب کے لیے وہ منحوس ترین دن ہوگا جب ان دونوں میں سے کوئی اپنی شکست مان لے گا۔ بسیار نویسی اور زود نویسی کے باوجود طنز و مزاح کا اعلیٰ ترین معیار برقرار رکھنا ایک معجزے سے کم نہیں۔ اور فکر صاحب برسوں سے یہ معجزہ دکھا رہے ہیں۔''

ڈاکٹر محمد حسن کا خیال ہے: ''فکر تونسوی کے مزاحیہ مضامین عصری زندگی کی ناہمواریوں پر مبنی ہیں۔ سوسائٹی کے داخلی میکانزم اور باہری رکھ رکھاؤ میں ایک عجیب قسم کا پُر لطف تضاد ہے۔ ''دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا''۔ اسی تضاد کو فکر مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ جیسے بلی چوہے کو کھانے سے پہلے اس سے کھیلتی رہتی ہے۔ کچھ وہی انداز فکر کا ہے۔''

فکر تونسوی کی ''آخری کتاب'' کے مقدمہ میں، بعنوان: " فکر تونسوی کون ہے؟" نریندر لوتھر نے فکر تونسوی کی بلند اخلاقی اور خوش خلقی کا تذکرہ کیا ہے۔انہوں نے تفصیل سے یہ تذکرہ بھی کیا ہے کہ کس طرح مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے اصرار پر 1974ء میں زندہ دلان حیدرآباد کی جانب سے منعقدہ کل ہند کانفرنس میں شرکت کی تھی جو ان کی سادگی اور خلوص کا مظہر تھی۔

فکر تونسوی کی شاعری: فکر تونسوی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔فکر تونسوی کا صرف ایک شعری مجموعہ ''ہیولے'' منظر عام پر آیا جو ان کے ابتدائی دور کے کلام پر مشتمل ہے۔ وہ ترقی پسند نظریات کے حامل تھے۔انہوں نے اپنی نظموں میں انہیں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بنیادی طور پر فکر تونسوی سماجی مساوات کے حامی تھے۔استحصال سے انہیں سخت نفرت تھی۔مختلف حیثیتوں اور مختلف جہتوں سے ڈھائے جانے والے مظالم اور سماجی عدم مساوات کے وہ مخالف تھے۔ان کا کلام بھی اسی کا آئینہ دار ہے۔فکر تونسوی کی نظموں میں معبود، مہا گیانی، اپنی پوجا، کن، حوا کی بیٹی، سوئمبر، شکنتلا، عوام، مشورہ، تب اور اب، بغاوت، وہی پرانی ریت، وہاں سے یہاں تک، زنداں ہراس وغیرہ اہم ہیں۔ان کے کلام میں چند غزلیں بھی ملتی ہیں۔فکر تونسوی کے کلام میں کہیں کہیں قنوطیت کا رنگ بھی نظر آتا ہے:

اور میں، مانوس غمگینی میں بل کھاتا ہوا — اور میں، ناکام سیّاروں سے شرماتا ہوا
وقت کے جادو بھرے جھولے میں لہراتا ہوا — آزمودہ کشمکش کے گیت دہراتا ہوا
دیکھتا ہوں خود کو غم خانے میں پھر آتا ہوا — اپنا غم خانہ جو رنگ اپنا بدلتا ہی نہیں

فکر تونسوی اور طنز ومزاح: فکر تونسوی بنیادی طور پر طنز ومزاح نگار ہیں۔ان کے یہاں طنز کے نشتر مزاح کے پیرائے میں پوشیدہ نہیں ہوتے بلکہ وہ طنز کے تیکھے وار راست کرتے ہیں، البتہ اس کی شدت کم کرنے مزاح کا استعمال کرتے ہیں۔اردو ادب میں طنز ومزاح کے سلسلے میں اہلِ انتقاد کا رویہ صاف اور واضح نہیں رہا ہے۔طنز ومزاح کو دوسرے درجے کا ادب تصور کیا جاتا ہے۔ادبِ عالیہ میں طنز ومزاح کا شمار نہیں کیا جاتا۔اس سلسلے میں فکر تونسوی کو اہلِ نقد کے اس رویہ سے شکایت نہیں تھی۔ وہ اس صورت حال کا زبردست ادراک رکھتے تھے۔انہیں اس بات کا اندازہ تھا کہ نقاد اپنی بالادستی کے لیے طنز ومزاح کو ادبِ عالیہ تسلیم کرنے میں پس وپیش کا شکار ہیں۔انہوں نے اس کیفیت کا شعوری تجزیہ کرتے ہوئے طنز ومزاح کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں یوں لکھا ہے:

''طنز ومزاح کے حق میں فقط ایک کلمہ تحسین یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسے ادبِ عالیہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔البتہ ایک نقاد نے نہ جانے اپنی موزونی طبع کے کمپلیکس میں ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا:"اگر آپ اصرار کرتے ہیں تو میں رعایتاً اسے ادب مان لیتا ہوں مگر ادبِ عالیہ چیزے دیگر است۔"

''ادب اور ادب عالیہ دونوں کا المیہ یہ ہے کہ نقاد کو ضد ہے کہ اسے ادبی خضر مانا جائے۔ چناں چہ ادیبوں کے غول کے غول آب حیات کے دیوتا کا پیچھا کرنے میں مشغول ہو گئے ہیں۔ یہ سوچے بغیر کہ دیوتا بیچارا خود آب حیات کا محتاج اور آب حیات سے محروم ہے۔''

''مگر طنز ومزاح نگار کا طرہ یہ ہے کہ اس کی تخلیقات کا ناتہ براہ راست قاری سے بنا رہا۔ درمیان میں نقاد کو نکال دیا گیا۔طنز قاری کو اور قاری طنز کو بھلی پر کار سمجھتے تھے کیوں کہ سمجھنے سمجھانے میں تجربیت نہیں تھی جس کے لیے نقاد کو تہہ در تہہ معنی دریافت کرنے کی زحمت دی جاتی۔اور پھر قاری طنز کو ادب عالیہ گردان کر پڑھتا ہے یا نہیں؟۔اس سوال کو وہ ایک پیچیدہ کو فت سمجھتا ہے اور نظر انداز کردیتا ہے۔ کیوں کہ وہ طنز ومزاح سے اپنی مطلوبہ طمانیت اخذ کر لیتا ہے۔اور یہی اس کا چشمہ آب حیات ہے۔اور نقاد شاید قاری کی اسی بے نیازانہ طمانیت سے چڑ اکر طنز کو ادب عالیہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔''

''یہ طنز ومزاح کی برتری ہے یا کمتری کہ ہر ملک میں، ہر زبان میں، ہر عہد میں معدودے چند طنز ومزاح نگار پیدائش کی زحمت فرماتے ہیں۔ دو چار صف اول کے طنز ومزاح نگار ابھرتے ہیں اور پھر جیسے پوری صدی ان پر گزر جاتی ہے۔۔۔''

☆☆☆

ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری' شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج برائے ذکور (خود مختار)، کڈپہ۔موبائل: 9441905026

راجہ نرسنگ راج عاؔلی آصف جاہی عہد کا شیریں زبان شاعر

حیدرآباد کے ایک کائستھ خاندان کی اردو دوستی کا سلسلہ آصفی عہد میں شروع ہوا جس کا آغاز سوامی پرشاد اصؔغر 1813ء سے شروع ہوتا ہے اور یہ سلسلہ پانچ پشتوں تک جاری رہا، جس سے ان کی اردو زبان سے دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس خاندان کا ادب سے بہت گہرا اور اٹوٹ رشتہ رہا۔ اس خاندان سے تعلق رکھنے والے ممتاز شاعر راجہ نرسنگ راج عاؔلی بھی جنہوں نے بھی ایوان شاؔد کے مشاعروں میں خوب داد وتحسین حاصل کی تھی۔

راجہ نرسنگ راج عاؔلی کی حیات وشخصیت سے متعلق سید رفیع الدین قادری اپنے مضمون ''راجہ نرسنگ راج عاؔلی'' میں جو معلومات فراہم کی ہیں، ملاحظہ ہوں:

''راجہ نرسنگ راج بہادر عالی حیدرآباد کے ایک قدیم کائستھ گھرانے میں 13/نومبر 1889ء میں پیدا ہوئے، آپ راجہ گردھاری پرشاد باقؔی کے چوتھے فرزند تھے، کم عمری میں ہی والد کے سایہ سے محروم ہوگئے، آپ کی تعلیم مدرسہ عالیہ میں ہوئی اور السِنہ فارسی، ہندی، مرہٹی خانگی طور پر گھر ہی پر سیکھے، آپ کی شادی کنہیا لال ساکن بھوپال کی دختر سے ہوئی تھی، جس میں راجہ کاشی نریش مہاراجہ نسویلہ نے بھی شرکت کی تھی۔ راجہ گردھاری پرشاد باقؔی کے اچانک انتقال سے اعلیٰ حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خان بہادر کو بہت صدمہ پہنچا تھا، اس لئے انہوں نے راجہ نرسنگ راج عاؔلی کو برحم خسروانہ رسم پرسہ میں سفید دوشالہ سے سرفراز فرمایا تھا نیز اسٹیٹ کورٹ آف وارڈ علاقہ صرف خاص کی نگرانی پر مقرر فرمایا اور بہ الطاف شاہانہ تمام خدمات دیوانی و علاقہ صرف خاص مبارک بحال فرمایا، آپ کو بموقع دربار جشن غفران مکان 1905ء پیشگاہ خسروی راجہ بہادر کا خطاب عطا ہوا، آپ کی اعلیٰ ذہانت کو دیکھتے ہوئے، 1905ء میں دفتر معتمد افواج سرکاری عالی میں بطور مددگار اعزاز مقرر کیا گیا اور پھر حقوق خاندانی مددگار محلات کے عہدہ جلیلہ پر فائز رہے، آپ کو علم و ادب ورثہ میں ملا تھا، آپ نے جو بھی اشعار لکھے، اس میں حدیث دل کی ترجمانی کی۔''

راجہ نرسنگ راج عالی کو ادبی بصیرت وتنظیمی صلاحیتیں وراثت میں ملی تھیں۔ انہوں نے ایک طرف تو اپنی پہچان ایک منتظم کی حیثیت سے بنائی اور دوسری طرف وہ عمدہ لب ولہجہ کے بہترین شاعر تھے۔ اکثر دور آصفی کے وزیر اعظم سر مہاراجہ کرشن پرشاد شاؔد کے گھر میں منعقدہ محافل میں شریک ہوتے بلکہ ان محفلوں کے انعقاد میں بھی انہوں نے بہترین کردار انجام دیا۔ مہاراجہ کرشن پرشاد شاؔد کو ان سے بہت زیادہ انسیت تھی وہ انہیں نہایت عزیز رکھتے تھے، عاؔلی بھی مہاراجہ کی قدر و منزلت اپنے حقیقی بزرگوں کی طرح کیا کرتے تھے، مہاراجہ شاد اس حد تک عاؔلی کو عزیز رکھتے تھے کہ ایوان شاد کا کوئی مشاعرہ ان کی شرکت کے بغیر مکمل خیال نہ کرتے تھے۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید سابق پروفیسر سری وینکٹیشورا یونیورسٹی تروپتی راجہ نرسنگ راج عاؔلی کے خاندان کی ادبی روایات سے متعلق رقم طراز ہیں:

''راجہ نرسنگھ راج عالیؔ اس خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جس کے ارکان آصفی سلطنت میں اعلیٰ مناصب پر فائز ہی نہیں تھے بلکہ سلطنتِ شعر وادب پر بھی جنھوں نے حکمرانی کی، عالیؔ کا سلسلہ رائے دولت رائے سے ملتا ہے جو نظام الملک آصف جاہ کے ہمراہ اورنگ آباد اور پھر حیدرآباد آئے، راجہ نرہری پرشاد کے بڑے صاحبزادے راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت باقیؔ تھے ان کو بھی سلطنتِ آصفی میں اعلیٰ مدارج حاصل رہے، شعروادب کا نکھرا ستھرا ذوق تھا۔ ان کی یادگار نظم ونثر کی کئی تصانیف ہیں، باقیؔ کی اولاد میں تین صاحبزادیوں کے علاوہ دو صاحبزادے راجہ نرسنگ عالیؔ اور راجہ محبوب راج محبوبؔ رہے، راجہ محبوبؔ راج بھی کلیدی عہدوں پر فائز تھے، ان کا شمار سلاطین آصفی کے جاں نثاروں میں ہوتا تھا۔ راجہ نرسنگ راج عالیؔ بھی اردو کے شاعر تھے غیر معمولی دلچسپی تھی۔''

اردو ادب سے کائستھ خاندان کو بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ آج بھی حیدرآباد کے کائستھ گھرانوں میں اردو زندہ ہے۔ راجہ نرسنگ راج عالیؔ کے پوتے ڈاکٹر نارائن راج بھی اردو زبان سے اپنے خاندانی وابستگی کی روایات کو جاری رکھے ہوئے انہوں نے ایک ٹرسٹ نرہری پرشاد چیرٹیبل ٹرسٹ قائم کیا ہوا ہے جس کے تحت انگریزی کتابوں کے ساتھ ساتھ اردو کی کتابیں بھی شائع کی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر حبیب نثار نے دیوان عالی پر تبصرہ کرتے ہوئے راجہ نرسنگ راج عالیؔ کے خاندان کی تفصیلات کو پیش کیا ہے، وہ رقمطراز ہیں:

''راجہ نرسنگ راج عالیؔ کے خاندان میں اردو شاعری کی شمع پانچ پشتوں سے روشن تھی، سکندر جاہ کے دورِ حکومت میں سوامی پرشاد اصغرؔ، ناصر الدولہ اور افضل الدولہ کے عہد میں راجہ نرہری پرشاد، نواب میر محبوب علی خاں کے زمانہ حکومت میں راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ بنسی راجہ اور نواب میر عثمان علی خان کے زمانہ اقتدار میں راجہ نرسنگ راج عالیؔ اور ان کے بھائی راجہ محبوب راج محبوبؔ نے دربار آصفی میں اس شمع کو فروزاں رکھا۔'' ۳؎

ڈاکٹر شیلا راج نے عہد آصفی کے معروف شعراء محبوب راج محبوبؔ اور راجہ نرسنگ راج عالیؔ کے کلام کو جو کہ بیاضوں میں محفوظ تھا بڑی محنت وجستجو اور تحقیقی وتنقیدی بصیرت کے ذریعہ سے مرتب کیا ہے۔

راجہ نرسنگ راج عالیؔ ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے جب تعصب وتنگ نظری نے ہندوستان کے مطلع کو زہر آلود نہیں کیا تھا، ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ کوششیں ایک ایسے ادب کی تیاری میں مصروف تھیں جو دونوں قوموں کی فکر اور اتحاد واتفاق کا آئینہ دار ہو اور اس دور کے دانشوران علم وادب ان کوششوں کو اصل رنگ یعنی صداقت اور حق کی نظر سے دیکھتے تھے۔

راجہ نرسنگ راج عالیؔ کا مجموعہ کلام ''دیوان عالیؔ'' کو ڈاکٹر شیلا راج نے مرتب کیا ہے جو 12 رفروری 2009ء کو نرہری پرشاد چیارٹیبل ٹرسٹ حیدرآباد کی جانب سے شائع ہوا، اس کتاب کی اشاعت سے قبل ہی محترمہ ڈاکٹر شیلا راج اس دنیا سے رخصت ہوگئیں، ان کے انتقال کے بعد یہ کتاب منظر عام پر آئی، اس کتاب کی طباعت ایس۔ اے آفسٹ پرنٹرز حیدرآباد پر عمل میں آئی۔ ڈاکٹر شیلا راج کی یہ مرتبہ تصنیف جملہ 216 صفحات پر مشتمل ہے، اس کتاب میں ڈاکٹر شیلا راج نے اپنے دادا خسر راجہ نرسنگ راج عالیؔ کے کلام کو ڈھونڈ نکالا اور نہایت محنت اور عرق ریزی سے مرتب کرکے اس کی اشاعت عمل میں لائی،

دراصل راجہ نرسنگ راج عالیؔ آصف جاہی دور کے آخری فرمان روا میر عثمان علی خان آصف سابع کے دربار سے وابستہ دکن کے مشہور و معروف شاعر تھے، اس مجموعہ میں جملہ 62 غزلیں، 3 قصیدے، 2 مرثیے، 66 رباعیاں اور 23 قطعات، 4 تاریخیں اور اہم عنوانات پر مشتمل نظمیں شامل ہیں، دیوان عالیؔ کا پیش لفظ نامور صحافی جناب زاہد علی خان مدیر سیاست حیدرآباد نے تحریر کیا ہے

بہرحال راجہ نرسنگ راج عالیؔ ایک علم دوست شاعر، ملی جلی تہذیب اور ہندو مسلم اتحاد کے ایک بہترین نمونہ تھے۔ آپ کے کلام میں سادگی اور صوفیانہ زندگی کی جھلک نمایاں تھیں، آپ کے متعلق کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ:

راجہ نرسنگ راج کو شیریں زباں دیکھا کئے
حضرت عالیؔ میں کیا کیا خوبیاں دیکھا کئے

راجہ نرسنگ راج عالیؔ کے کلام میں حسن و عشق، ہجر و وصال، گل و بلبل اور لب و رخسار جیسے موضوعات پائے جاتے ہیں۔ ان کی عاشق مزاجی، شوخی، خوش طبعی اور رنگینی خیال دیدنی بھی اشعار میں نمایاں محسوس کی جاسکتی ہے:

دیکھا تھا اس کو آنکھ نے دل ہوگیا فگار
کس کی خطا تھی اور چلا کس پہ وار ہے
جانے کیا آنکھ میں بھرا جادو
ایک دنیا اسی میں بستی ہے
پڑ جاتی ہے جس پر اسے کردیتی ہے بے خود
یہ آنکھ تمہاری ہے کہ جادو ہے بلا ہے

راجہ نرسنگ راج عالیؔ نے اپنی شاعری میں غزلوں، نظموں کے علاوہ رباعی پر بھی طبع آزمائی کی ہے جس کے ذریعے انہوں نے سماج میں پھیلنے والی برائیوں کے خلاف آواز اٹھائی، جوئے سے تباہی اور بربادی کے اثرات سے لوگوں کو آگاہ کرنے کی کوشش کی، ان خیالات کی عکسی کرتی ان کی یہ رباعیاں:

جوئے میں ہے قتل اور لڑنا زیادہ
سنبھلنا ہے کم اور اجڑنا زیادہ
کہیں اور کیا مختصر ہے یہ عالیؔ
کہ بننا ہے کم اور بگڑنا زیادہ
ہر اک گھر میں ہوتا شوالا نہیں ہے
اندھیرے میں ہرگز اجالا نہیں ہے
نہ کھیلے جوا کوئی ہے حکمِ مذہب
دیوالی ہے یہ کچھ دیوالا نہیں ہے

راجہ نرسنگ راج عالیؔ بھی قومی یکجہتی کے علمبردار انسان تھے، وہ انسان دوستی کے شاعر تھے، انہوں نے ہندو مسلم میں کبھی کوئی فرق نہیں کیا اور وہ حب الوطن شاعر تھے ان کی اس رباعی سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے دیکھیں:

حق والو بتاؤ دیر و حرم کہاں
جب ایک وطن میں ہوتو پھر بیر کہاں
خالق دونوں کا جب نہیں دو عالیؔ
ہندو مسلم ہیں ایک غیر کہاں

ان کی ایک مشہور نظم جو جشن آزادی کے سلسلہ میں 9/اگست 1950ء کو ہندوستانی کلچر سوسائٹی کے مشاعرے میں پڑھی گئی تھی:

مبارک ہند والو آپ کو یہ جشن آزادی
دلوں پر جوش عشرت ہے لبوں پر نغمۂ شادی
مبارک سارے نیتاؤں کو اب امید برآئی
ہوئے خوش پارسی ہندو مسلماں اور عیسائی

سلامت رہ تو آزادی کہ سب تجھ سے سلامت ہیں
غلامی ٹل گئی آزاد اب ہم تاقیامت ہیں
بہت محنت سے برسوں کی بہت کاوش سے صدیوں کی
بجھی ہے پیاس بھارت کی امیروں کی غریبوں کی

آخری زمانے میں آپ ذیابطیس کے مرض میں مبتلا ہوئے اور مختصر سی علالت کے بعد بتاریخ ۲۳ رجون سنہ ۱۹۵۷ء کو بروز ایکادسی جو ہندوؤں کے لئے ایک مبارک دن ہے آپ کا انتقال ہوا، راجہ نرسنگ راج عالیؔ کے انتقال کے بعد ان کی پوتی بہو ڈاکٹر شیلا راج نے ان کے کلام کو اکٹھا کیا اور ''دیوانِ عالی'' کے نام سے شائع کیا۔

واضح رہے کہ پون کماری' نے ''راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ کے خاندان کی ادبی خدمات'' پر عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم۔فل ڈاکٹر عزیز سہیل نے ''ڈاکٹر شیلا راج کی تاریخی وادبی خدمات'' پر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے پی ایچ۔ڈی اور حالیہ عرصہ میں محمد خالق نے ''راجہ نرسنگ راج عالیؔ'' پر یونیورسٹی آف حیدرآباد سے پی ایچ۔ڈی کی تکمیل کی ہے۔راجہ نرسنگ راج عالیؔ کے خاندان کے مختلف لوگوں کے نام سے ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں فیلوشپ اور گولڈ میڈل ریسرچ کے میدان میں عطا کئے جاتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد عبدالعزیز سہیل
لکچرر گورنمنٹ

مضامین

نظم ٹیپو

اٹھا وہ خاک سرنگا پٹم سے مرد جری
بدیسیوں کی حکومت تھی لرزہ بر اندام
وہ اولین مجاہد کہ جس نے فرمایا
رہے گا ہند نہ ہرگز فرنگیوں کا غلام
پڑھائی اہل وطن کو نماز آزادی
سکھائے جس نے ہمیں اس کے سب سجود و قیام
بنائے طرز نوی جس نے کی تھی مستحکم
بدل کے رکھ دیا جس نے قدامتوں کا نظام
فلاح قوم کا جس نے کیا بلند علم
رہی تھی جس کو مقدم ہمیشہ خیر انام
وہ جاں فروش دلارا دکن کے حیدر کا
جو اپنی ذات سے خود تھا مجاہدوں کا امام
کہا یہ جس نے کہ اہل وطن کا ہے یہ وطن
نہ غاصبوں کا نہ اغیار کا ہے کوئی مقام
گواہ عظمت ٹیپو ہے رود کاویری
یہیں ہوا تھا نبرد آزما وہ خوش فرجام
شہید کا اسے دیتی ہے مرتبہ تاریخ
بہ کیش صدق و صفا ہے یہی بڑا انعام
ازل سے بات چلی آئی ہے زمانے میں
جو نیک بندے ہیں ہوتا ہے ان کا نیک انجام
منار مسجد جامع سے دے رہا ہوں صدا
دکن کی خاک کے ذرو تمہیں ہزار سلام

پنڈت بالمکند عرشؔ ملسیانی

اردو صحافت اور غیر مسلم صحافی

اردو خود ایک مخلوط زبان ہے جس میں دنیا کی تقریباً تمام زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ جو خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اس زبان کی آغوش میں سب کو سمیٹ لینے کی صلاحیت موجود ہے۔ جہاں تک اردو صحافت کا تعلق ہے 160 برس پہلے جب اس کا آغاز ہوا تھا تب فارسی کا سنہری دور اور اردو کا ابتدائی دور تھا۔ انگریزی کو غیر ملکی زبان سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ انگریزوں کے خلاف تحریک چل رہی تھی اس لئے ہم وطن افراد میں شعور بیدار کرنے ان کی رائے عامہ ہموار کرنے کے لئے یا تو فارسی یا پھر اردو کا اخبار ہی نکالا جاسکتا تھا۔ ایسے ہی ہوا۔ اخبار ''جام جہاں نما'' جسے اردو کا پہلا اخبار کہا جاتا ہے، ہری ہر دت بنگو اور منشی سدا سکھ نے مل کر کلکتہ سے نکالا تھا۔ یہ فارسی اور اردو کا ملا جلا اخبار تھا۔ تب سے لے کر آج تک اردو صحافت میں غیر مسلم صحافیوں نے بڑا اہم رول ادا کیا۔ جب کہ اردو ادب کی عمارت جن ستونوں پر ٹکی ہوئی ہے اس کی بنیادوں میں غیر مسلم شعراء اور ادیبوں کا غیر معمولی رول رہا ہے۔ چکبست، رتن ناتھ سرشار، پریم چند، تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد (جنہوں نے پاکستان کا پہلا قومی ترانہ لکھا تھا)، کرشن چندر، جوگیندر پال، بلونت سنگھ، راجیند رسنگھ بیدی، گلزار، نریش کمار شاد، کرشن موہن، آنند نرتشی، گلزار دہلوی، آنند نارائن ملا، فراق گورکھپوری، جیسے شعرائے کرام اور ادیبوں نے گیسوئے اردو کو سنوارا ہے۔ حسرت، اندیور، آنند بخشی کی فلمی شاعری نے اردو کو فلموں کی زبان بنادیا۔ جگجیت سنگھ، پنکج اُدھاس، منوہر اُدھاس، بھوپیندر، پیناز مسانی، انیتا سانگھوی، سونو نگم کی پُرسوز آواز نے اردو غزلوں کو ایک نئی زندگی دی۔ اس طرح اردو کی ترویج واشاعت میں غیر مسلم ابنائے وطن نے اہم رول ادا کیا۔ منشی نول کشور نے نہ صرف اودھ اخبار نکالا بلکہ انہوں نے مطبع نول کشور قائم کیا جو ایشیاء کا ایک ممتاز چھاپہ خانہ بن گیا جس نے ہزاروں کی تعداد میں اردو کتابیں شائع کیں۔ دوسری طرف گلشن نندا، کرنل رنجیت کے ناول اردو دنیا میں پسند کئے جاتے رہے۔

اردو صحافت میں لالہ دینا ناتھ کا نام بھی عزت واحترام کے ساتھ لیا جاتا ہے جنہوں نے ہندوستان، دیش اور ماہنامہ دیپک جیسے اردو اخبارات اور جرائد جاری کئے۔ منشی دیا نارائن نگم نے روزنامہ زمانہ جاری کیا۔ خوشتر گرامی نے ہندوستان کا سب سے معیاری اردو رسالہ ''بیسویں صدی'' جاری کیا جس کی بدولت کئی ادیب اور شاعر منظر عام پر آئے۔ اردو صحافت میں خشونت سنگھ اور کلدیپ نیر کے نام بھی قابل احترام ہیں۔ لالہ جگت نارائن، یدھ ویر جی، رنبیر نے بھی اردو صحافت کی خدمت انجام دی ہے۔ موہن چراغی ایک طویل عرصہ تک اردو صحافت سے وابستہ رہے، وہ ''قومی آواز'' کے ایڈیٹر رہے۔ چندر سریواستو کی اپنی پہچان رہی۔ اردو کے زبردست خدمت گذار رہے۔ بعد میں وہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور اپنا نام حسین علی خان رکھا۔ نرہری صاحب برسوں روزنامہ سیاست سے وابستہ رہے۔ بہرام سنگھ منصف سے اب بھی وابستہ ہیں۔ رتنا چوٹرانی تین دہائیوں سے ادارہ سیاست سے وابستہ ہیں۔ ستیم رہنمائے دکن سے وابستہ رہے۔ انہوں نے اردو سیکھی اور اپنی بیٹی کو اردو سکھائی۔ گربچن چندر دہلی نے اردو صحافت سے متعلق کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان کے تحقیقاتی مضامین، تجاویز اور مشورے صحافیوں کے لئے مشعل راہ

ہیں۔ سنجیو سراف کا تعلق نئی نسل سے ہے مگر انہوں نے ویب سائٹس ''ریختہ'' کے ذریعہ اردو زبان وادب کی غیر معمولی خدمت انجام دی ہے۔ ان کا تحقیقاتی کام قابل تحسین ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو سے محبت کسی ایک مخصوص فرقے تک محدود نہیں۔

راموجی راؤ نے ای ٹی وی اردو کے ذریعہ اردو کو دنیا بھر میں پہنچا دیا یہ اور بات ہے کہ خود راموجی راؤ نہ اردو پڑھ سکتے ہیں اور نہ بول سکتے ہیں' اس کے باوجود اردو کے لئے ان کی خدمات غیر معمولی ہیں جس کا اعتراف نہ کرنا احسان فراموشی ہے۔ بدقسمتی سے ای ٹی وی اردو کو ساری دنیا میں مقبولیت کے باوجود تجارتی اعتبار سے زیادہ کامیابی نہیں ملی۔ راموجی راؤ نے ای ٹی وی فروخت کردیا اور ای ٹی وی بھارت شروع کیا جو سٹیلائٹ چیانل نہیں ہے۔ غیر مسلم حضرات نے اردو اخبارات اور ٹی وی چیانلس کے ذریعہ اردو کو فروغ دیا اور اردو کے ذریعہ قومی یکجہتی کے جذبوں کو پروان چڑھایا۔

اردو کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ صرف مسلمانوں کی زبان ایسا نہیں ہے۔ یہ تمام ہندوستانیوں کی زبان ہے۔ یقیناً اس سے اتفاق کیا جاسکتا ہے کیوں کہ جو لوگ اردو رسم الخط سے واقف نہیں ہیں' وہ جو بولی بولتے ہیں وہ اردو ہی ہے۔ چونکہ اس زبان کے بولنے والوں کی اکثریت مسلمانوں کی ہے اور مسلمانوں کی اکثریت اپنا مذہبی لٹریچر جیسے قرآن کا ترجمہ اور تفسیر، احادیث، اقوال زریں، حکایات، اولیائے کرام کے واقعات سب کچھ اردو ہی میں پڑھتی ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلامی تعلیمات محبت، امن، بھائی چارگی، وطن سے محبت، پڑوسیوں کے حقوق کی ادائیگی کا درس دیتی ہیں۔ اسلئے یہ زبان بنیادی طور پر اتحاد و یکجہتی، امن اور بھائی چارگی کی زبان ہے۔ اردو شاعری بھائی چارگی، اخوت و محبت، فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے جذبوں کو پروان چڑھانے میں اپنا رول ادا کرتی رہی۔ علامہ اقبال نے سری رام پر نظم لکھی پھر ان کا یہ شعر فرقہ وارانہ اتحاد کیلئے ضرب المثل سمجھا جاتا ہے:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہیں' ہندوستاں ہمارا

اور پھر ہندوستانی بچوں کے قومی گیت میں علامہ اقبال کہتے ہیں:

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

اسی طرح نذیر اکبرآبادی نے اپنی شاعری میں ہولی' دیوالی جیسی نظمیں لکھ کر اردو کی وسعت کو ثابت کیا۔ جوش ملیح آبادی نے کسی قدر غلو کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کے لئے صدا لگائی تھی۔ تحریک آزادی کے دوران احمق پھپھوندی نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے آواز لگائی:

گئے وہ دن کہ تھا جب اختلاف ہندو و مسلم
بس اب اک دوسرے کے مونس و غم خوار ہو جاؤ
دکھادو اپنی قوت اپنے دشمن کے مقابل میں
وہ پتھر ہے تو اک آہنی دیوار ہو جاؤ

☆☆☆

ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز
چیف ایڈیٹر ہفتہ وار ''گواہ''
میڈیا پلس' گن فاؤنڈری' حیدرآباد 500 001
فون:9395381226

غیر مسلم شعراء کی نعت گوئی

بلا شبہ نعت نگاری اور نعت خوانی رب ذوالجلال کا ایک ایسا بے مثال اور لازوال عطیہ ہے جو صرف ان سخن شناسوں، سخن طرازوں اور شعرا و ادباء کو ودیعت کیا جاتا ہے جو حقیقی معنوں میں حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے ساتھ بے پایاں عقیدت و محبت کی کیفیات سے لبریز ہوتے ہیں۔ یہ امر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ فنِ نعت گوئی ہر کس و ناکس کو عطا نہیں ہوتا۔ یہ وصف، نعمت و سعادت صرف ان خوش نصیبوں کا مقدر بنتی ہے جو حضور نبی اکرم ﷺ کے عشق کو اپنی حیاتِ مستعار کا عظیم اثاثہ اور سرمایۂ افتخار جانتے ہیں۔

اگر نعتیہ شاعری کے مختلف ادوار کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ ولادتِ نبوی ﷺ سے قبل ہی نعت کی صنفِ سخن ادب کے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو چکی تھی اور ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ ظہورِ قدسی کے بعد اولین کلماتِ حق آپ کی والدہ ماجدہ ہی نے آپ ﷺ کی شان میں ارشاد فرمائے تھے۔ جب حضرت حلیمہ سعدیہ نورِ کائنات ﷺ کو عرب روایات کے مطابق پرورش کے لیے لے کر جا رہی تھیں تو آپ ﷺ کی والدہ ماجدہؓ کی زبان مبارک سے بے ساختہ یہ اشعار ادا ہوئے جنہیں ولادتِ نبوی ﷺ کے بعد پہلی نعت ہونے کا شرف حاصل ہے جس کا مفہوم ہے ''میں اپنے بچے کو خدائے ذوالجلال کی پناہ میں دیتی ہوں''۔ نعت کی تاریخ کا جب سرسری سا بھی جائزہ لیا جائے تو دوسری نعت حضور نبی اکرم ﷺ کی رضاعی بہن شیما بنت الحارث سے منسوب ملتی ہے۔ آپ ﷺ کو وہ بہلاتیں تو یہ لوری کہتیں ''اے پروردگار تو ہمارے محمد ﷺ کو باقی رکھ یہاں تک کہ میں انہیں نوعمر، جوان دیکھ لوں اور پھر انہیں سردار عالی مقام دیکھوں، تو ان کے دشمنوں اور حاسدوں کو یک لخت مغلوب کرنا اور انہیں دائمی عزت وعظمت اور غلبہ عطا فرمانا''۔

حضور پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام تمام جہانوں کے لیے رحمت اللعالمین بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے: ''اور ہم نے تیرے ذکر کو بلند کر دیا''۔ یہی وجہ ہے کہ چودہ سو سال گزرنے کے باوجود حضور پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکرِ خیر جاری و ساری ہے اور قیامت تک اسی طرح جاری و ساری رہے گا۔ حضور پاک علیہ الصلو ۃ والسلام کی شان اقدس ان کے ماننے والوں کے ساتھ ساتھ نہ ماننے والوں نے بھی بیان کی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک عالم گیر شخصیت کے حامل افضل ترین بشر ہیں۔ اس تحریر میں، میں چند غیر مسلم شعرا کی نعتیں تحریر کروں گا تا کہ آپ کو اندازہ ہو کہ حضور پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام سے انصاف پسند غیر مسلم بھی والہانہ عقیدت و محبت رکھتے ہیں۔

جسٹس رانا بھگوان داس کی نعت کے چند اشعار:

کلام اللہ مداح است و محبوب خدا باشی
محمد مصطفیٰ و منزل صل علیٰ باشی
امام المرسلیں ختم النبیین و جلوہ ٔیزداں
فروغِ دوجہاں شمس الضحیٰ بدرالدجی باشی
عجم نازاں بہ ذاتِ تو عرب نازاں بہ شان تو
امینِ رازِ توحید و حبیب کبریاء باشی
سلام اے ہادیٔ انساں سلام اے خواجۂ بھگواں
خدائے پاکِ نام تو محمد مصطفیٰ باشی

یوں تو اردو شاعری میں ایسے غیر مسلم شعرا کی لمبی قطار نظر آتی ہے جنھوں نے ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں شاعری تخلیق کی ہے لیکن یہاں کچھ شعرا کا تذکرہ کیا جائے گا جن کی شاعری میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں ذات مصطفیٰ اور صفات مجتبیٰ کی عکاسی ملتی ہے۔ ان غیر مسلم نعت گو شعراء میں مہاراجہ کشن پرشاد شاد، سرور جہاں آبادی، جگن ناتھ آزاد، فراق گورکھپوری، منشی شنکر لال ساقی، ہری چند اختر، کنور مہندر سنگھ بیدی، عرش ملسیانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ذیل میں ان شعرا کا مختصر تعارف پیش کیا جائے گا اور ان کے نعتیہ اشعار کے نمونے بھی پیش کیے جائیں گے۔

منشی شنکر لال ساقی: 1820ء میں سکندر آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ غالبؔ اور مومنؔ کے ہمعصر تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے شاعروں میں شرکت کا فخر بھی حاصل تھا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں آپ نے شعر کہے ہیں اور شعروشاعری میں غالب اور مرزا ہرگوپال تفتہ سے کسبِ فیض کیا تھا۔ منشی شنکر لال ساقی کے دل میں سرور دو عالم ﷺ کی عظمت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شان میں نعتیں لکھنے سے اپنے آپ کو روک نہ سکے۔ ملاحظہ کیجئے:

تھی شب معراج میں سارے فلک پر چاندنی
نورِ محبوب خدا سے تھی منوّر چاندنی
عرش و کرسی پر کہاں تھا ماہ کا نام و نشاں
روئے احمد چاند تھا، اس سے تھی یکسر چاندنی
کھل گئی جاتے ہوئے جب کاکلِ عنبر فشاں
ہوگئی فیضانِ نکہت سے معطّر چاندنی
کیا کہوں صلِ علیٰ، صلِ علیٰ، صلِ علیٰ
رہ گئی تھی دیکھ کر حیران و ششدر چاندنی

مہاراجہ کشن پرساد شادؔ: 1864ء میں حیدرآباد آندھراپردیش میں پیدا ہوئے۔ اردو نعت گوئی میں آپ کا بہت ہی بلند مقام حاصل ہے اور آپ نے کثیر تعداد میں نعتِ رسول کہی ہیں۔ آپ کے اشعار حُبِ رسول سے بھرے ہوئے ہیں۔ آپ کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ''ہدیہ شادؔ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ شادؔ کو پیغمبر اسلام سے بے حد عقیدت تھی اور انہوں نے اپنی شاعری میں حضور ﷺ کے اوصافِ حسنہ کا دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

کانِ عرب سے لعل نکل سرتاج بنا سرداروں کا
نام محمد اپنا رکھا سلطان بنا سرکاروں کا
باندھ کے سر پر سبز عمامہ کاندھے رکھ کر کالی کملی
ساری خدائی اپنی کر لی مختار بنا مختاروں کا
روپ ہے تیرا رتی رتی نور ہے تیرا پتی پتی
مہرو مہ کو تجھ سے رونق بنا سیّاروں کا
کافر ہوں کہ مومن ہوں خدا جانے کہ کیا ہوں
پر بندہ ہوں ان کا جو ہے سلطانِ مدینہ
عاشق ہوں مجھے جنت فردوس سے کیا کام
ہے سر میں ازل سے مرے سودائے مدینہ

درگا سہائے سرور جہاں آبادی: 1873ء میں جہاں آباد ضلع پیلی بھیت میں پیدا ہوئے۔ پہلے وحشتؔ کے نام سے لکھتے تھے پھر اپنا تخلص سرورؔ رکھا۔ سرورؔ کو مذہب سے گہرا لگاؤ تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کے قائل تھے اور یہی وجہ ہے کہ اپنی شاعری میں حضور ﷺ کی شان میں اپنے عقیدے کا اظہار کیا ہے۔ ان کی نعتیہ شاعری میں داخلیت اور خارجیت دونوں کی کامیاب کارفرمائی نظر آتی ہے۔ سرورؔ اسلامی تعلیمات سے بخوبی واقف تھے۔ پیغمبر اسلام سے آپ کی عقیدت ان اشعار سے خوب عیاں ہوتی ہے۔

مضامین

دلِ بے تاب کو سینے سے لگالے آجا
کہ سنبھلتا نہیں کم بخت سنبھالے آجا
پاوں ہیں طولِ شبِ غم نے نکالے آجا
خواب میں زلف کو مکھڑے سے لگالے آجا
بے نقاب آج تو اے گیسوؤں والے آجا
نہیں خورشید کو ملتا تیرے سائے کا پتہ
کہ بنا نورِ ازل سے ہے سراپا تیرا
اللہ اللہ ترے چاند سے مکھڑے کی ضیا

فراق گورکھپوری : اصل نام رگھوپتی سہائے اور فراقؔ تخلص تھا۔ 1896ء میں گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اردو رباعی گوئی میں اہم مقام حاصل کیا' نعتیہ اشعار بھی لکھے ہیں۔ اپنی رباعیوں میں سرورِ دوعالم ﷺ کی خوبیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ رباعی ملاحظہ کیجیے:

انوار ہیں بے شمار معدود نہیں
رحمت کی شاہراہ مسدود نہیں
معلوم ہے کچھ تم کو محمد کا مقام
وہ امت اسلام میں محدود نہیں

عرشؔ ملسیانی: اصل نام بالمکند تھا اور عرشؔ تخلص لیکن ادبی دنیا میں عرشؔ ملسیانی کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ''آہنگ حجاز'' کے نام سے منظر عام پر آ چکا ہے جس میں دس نعتیہ غزلیں شامل ہیں۔ عرش ملسیانی نے اکثر نعتیں چھوٹی مترنم بحروں میں لکھی ہیں۔ عرش ملسیانی نے اپنی شاعری میں حضور اقدس ﷺ کی ذاتِ اقدس سے عقیدت و محبت کا اظہار کیا ہے:

ہے جبریل در کا غلام اللہ اللہ
نبوت کا یہ اہتمام اللہ اللہ
یہ ملت کی شیرازہ بندی کا آئین
یہ تنظیمِ دیں کا نظام اللہ اللہ
یہ اُمّی پیمبر کا جوش فصاحت
بشر کی یہ شان حقیقت نمائی
چل اے عرشؔ ہو تو مدینہ کا عازم
نہیں راس دنیا کی ہنگامہ آرائی

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ: اردو ادب میں ایک کثیر الجہات شخصیت کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ اردو نعت گوئی میں آپ کو ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ اپنی شاعری میں رسول اکرمؐ کی شان میں بہت عمدہ خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ نمونے کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

تکمیلِ معرفت ہے محمد رسول کی
ہے بندگی خدا کی اطاعت رسول کی
نسانیت، محبت باہم، شعور و فکر
جو چیز بھی ہے سب ہے عنایت رسول کی
ہے مرتبہ حضور کا بالائے فہم و عقل
معلوم ہے خدا ہی کو عزت رسول کی
اتنی سی آرزو ہے بس اے ربِّ دو جہاں
دل میں رہے سحرؔ کے محبت رسول کی

جگن ناتھ آزادؔ: 1918ء میں عیسیٰ خیل ضلع میانوالی پنجاب میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام تلوک چند محروم تھا۔ جگن ناتھ آزاد کو شاعری سے دلی لگاؤ تھا۔ اقبال اور جوش کی شاعری سے کافی متاثر تھے۔ آزاد نے بارگاہِ رسالت میں گلہائے عقیدت نعتیہ شاعری کی شکل میں پیش کیے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

سلام اس ذات اقدس پر، سلام اس فخرِ دوراں پر
ہزاروں جس کے احسانات ہیں دنیائے امکاں پر

سلام اُس پر جو حامی بن کے آیا غم نصیبوں کا
رہا جو بیکسوں کا آسرا، مشفق غریبوں کا
مددگار و معاون بے بسوں کا زیردستوں کا
ضعیفوں کا سہارا اور محسن حق پرستوں کا
سلام اُس پر جو آیا رحمتہ للعالمین بن کر
پیام دوست لے کر صادق الوعد دامین بن کر

غیر مسلم شعرا کی نعت گوئی کا سلسلہ آپ ﷺ کی حیات مبارکہ سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اعشیٰ میمون بن قیس جو کہ زمانہ جاہلیت کا مشہور شاعر تھا۔ سوق عکاظ میں جس کے قصائد کی دھوم تھی نیز سبعہ معلقہ کے ایک شاعر کے طور پر بھی جانا جاتا ہے جن کے قصائد خانہ کعبہ کی دیواروں پر آویزاں کیے جاتے تھے اس نے بھی نعت کہی تھی۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ وہ نعتیہ اشعار کہہ کر حضور اقدس کی خدمت میں جارہا تھا کہ مسلمان ہوجائے مگر اہل عرب نے کسی طرح اس کو اس ارادے سے باز رکھا۔ فارسی اور اردو شاعری میں غیر مسلم شعرا کی نعت گوئی کا سلسلہ تاریخی تسلسل کے ساتھ ملتا ہے۔ جنوبی ہند سے ہی غیر مسلم شعرا کی نعت گوئی کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ چونکہ اردو کا خمیر ہندستان کی سرزمین سے اٹھا ہے اور یہاں کے خمیر میں پیار، محبت، روحانیت اور رواداری شامل ہے۔ مسلمانوں کے روحانی نظام کو سرزمین ہند سے اور سرزمین ہند کے روحانی نظام کو مسلمانوں سے کبھی اجنبیت نہیں محسوس ہوئی۔ اس باہمی انس و محبت سے ایک عظیم مشترکہ تہذیبی وراثت بھی وجود میں آئی اور سچ یہ ہے اردو زبان بھی اسی انس و محبت کا نتیجہ ہے۔

ہندستان کی سماجی تاریخ پر نگاہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہاں آنے والے صوفیا کی تعلیمات کا مرکز و محور حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تھی۔ اس لیے جب ان صوفیا نے ہندستانی سماج یا معاشرے کو اپنے کردار و اخلاق اور تعلیمات سے متاثر کرنا شروع کیا تو خود بہ خود رسول کریم کی ذات و شخصیت بھی مثالی بنتی گئی۔ کرشن بہاری نور لکھنوی نے اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے:

ایمان اس کو کہتے ہیں اے اہل بندگی!
اک اجنبی کی بات پہ سب کو یقین ہے

نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلم شعرا کی کئی نسلیں سامنے آتی گئیں اور ان شعرا کے کلام کا وقیع ذخیرہ اردو کے نعتیہ ذخیرہ کا حصہ بنتا گیا۔ قابل ذکر نعت گو اردو شعرا میں جگن ناتھ آزاد، جگن ناتھ کمال کرتار پوری، فراق گورکھپوری، دلو رام کوثری، آنند موہن زتشی، ستیا پال آنند، عرش ملسیانی، شنکر لال ساقی، ہری چند اختر، اشونی کمار اشرف، اوما شنکر شاداں، امر ناتھ آشفتہ دہلوی، برج نارائن کیفی، بالا سہائے متصدی، بھگوت رائے راحت کاکوروی، بہادر برق، تربھون شنکر عارف، پربھو دیال رقم، تلوک چند محروم، رویندر جین چاند بہاری لال ماتھر صبا، پیارے لال رونق، تربھون ناتھ دہلوی، چندر بھان خیال، چندی پرشاد شیدا، چندر پرکاش جوہر بجنوری، درگا سہائے سرور، دیا پرساد غوری، دیا شنکر نسیم لکھنوی، روپ چند، شگن چند جین روشن، شیو پرشاد وہبی لکھنوی، کرشن موہن، کشن پرشاد، گلزار دہلوی، گوہر دہلوی، لبو رام جوش ملسیانی، لچھمی نرائن سخا، مکھن لال مکھن، مہر لال سونی ضیا، ہری مہتا ہری، مہندر سنگھ بیدی، نوبت رائے نظر شامل ہیں۔

☆☆☆

مضامین

لچھمی نارائن شفیق کی شاعری میں اسلامی نظریات

لچھمی نارائن شفیق دکن کے اہلِ قلم افراد میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔انھوں نے اردو نثر اور شاعری میں کئی اہم تصانیف چھوڑی ہیں۔ان کی تحریروں کے یوں تو بے شمار نمایاں وصف ہیں لیکن ایک قابلِ توجہ خصوصیت اسلامی نظریات وتعلیمات پر ان کی گہری نظر وفکر ہے۔انھوں نے اپنے کلام میں دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ اسلامی نظریات اور تعلیمات پر بڑی عمدگی سے لکھا ہے۔ جنوبی ہندوستان کے علاقہ دکن میں بہمنی سلطنت کے قیام سے ہی ایک سیکولر حکومت کی بنیادیں استوار ہونی شروع ہوگئی تھیں۔بہمنی سلاطین نے جنوبی ہند میں بسنے والی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو آپس میں جوڑ کر متحد کرنے کی کامیاب کوششیں کی تھیں۔ساتھ میں مختلف مذاہب کی قوموں میں اتحاد، میل جول، بھائی چارہ، سماجی معاملات اور انسان دوستی کے تصورات کو بھی عام کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔بہمنی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کے بعد قطب شاہی، احمد شاہی اور عادل شاہی سلاطین نے بھی بین مذہبی اور مشترک تہذیب وتمدن کے استحکام اور فروغ میں بھرپور حصہ لیا۔آگے چل کر آصف جاہی دور میں ان روایات کو مزید تقویت نصیب ہوئی۔چنانچہ سلاطینِ وقت کی جانب سے مقامی رسوم ورواج، قومی اتحاد، یکجہتی اور بھائی چارہ کی حوصلہ افزائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوامی سطح پر بھی آپسی محبت، باطنی یک رنگی، ایک دوسرے کا احترام اور اندرونی مفاہمت پیدا ہوتی چلی گئی۔عوام وخواص کے لباس، رسوم ورواج، عید وتہوار سب کچھ مشترک ہوتے چلے گئے اور سیکولر روایات دکن کی تہذیب کا حصہ بن گئیں۔دکن کے اسی مشترکہ سماجی وتہذیبی پس منظر میں دکنی زبان وادب کی نشو ونما ہوتی رہی اور تحریریں اس ماحول کی ترجمان بنتی رہیں۔اس دور کے ادیب وشاعروں نے بلاتخصیصِ مذہب اپنی تحریروں میں ایک دوسرے کے مذاہب، روایات اور عقاید کو نہایت ادب واحترام سے پیش کیا۔سیکولر روایات ونظریات کے حوالے سے دکنی ادب بہترین ماخذ ثابت ہوتا ہے۔بیشتر دکنی شعراء نے مقامی ہندو روایات واعتقادات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور کئی واقعات، تشبیہات واستعارات کو اپنے کلام میں بہت خوبی سے استعمال کیا۔حتیٰ کہ صوفیائے کرام نے بھی اپنی تعلیمات کو ہندوستانی مذہب سے مطابقت رکھنے والے مزاج کے ساتھ پیش کیا۔

دکنی زبان میں جہاں مسلم شعرا وادباء نے اپنی تحریروں میں ہندو مذہب کے عقائد، روایات اور طرزِ معاشرت کو موضوع بنایا ہے وہیں غیر مسلم شعراء بھی اپنی تحریروں میں اسلامی روایات ونظریات کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔کئی ایک غیر مسلم شعراء نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء، مدحتِ رسولؐ میں نعت گوئی اور حضرت علی یا دوسرے بزرگانِ دین کی عقیدت میں منقبت بڑے خشوع وخضوع سے لکھی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ دکنی ادب کی تاریخ میں بڑی ہمہ رنگی اور انفرادیت نظر آتی ہے۔دکنی زبان کے غیر مسلم ادیب وشعراء میں لچھمی نارائن شفیق نہایت اہمیت کا حامل نام ہے۔لچھمی نارائن شفیق کی اصل شناخت بہ حیثیتِ تذکرہ نگار اور مورخ کی حیثیت سے مقبول رہی ہے۔ان کے تذکرے ''چمنستانِ شعرا'' (۱۱۷۵ھ)، ''گلِ رعنا'' (۱۱۸۱ھ)، اور ''شامِ غریباں'' (۱۱۸۱ھ)، تذکرہ نگاری کی تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ شفیق کے تذکروں کی اہمیت نے ان کی شاعرانہ حیثیت کو پسِ پشت ڈال دیا۔جس کے نتیجہ میں شفیق بہ حیثیت شاعر کے وہ شہرت نہ پاسکے جس کے وہ مستحق تھے۔

لچھمی نارائن شفیق ذات کے کھتری ہندو تھے۔شفیق کے والد رائے منسا رام آصف جاہ اول کے دورِ حکومت میں دکن کے مختلف صوبہ جات کی پیشکاری کی خدمات پر مامور تھے۔شفیق کے اجداد لاہور کے رہنے والے تھے۔ان کے دادا بھوانی داس اورنگ زیب کی فوج کے ساتھ شمالی ہند سے اورنگ آباد چلے آئے تھے اور یہیں مقیم ہوگئے تھے۔اورنگ آباد میں مغل حکومت کے خاتمہ کے بعد آصف جاہی سلطنت کا قیام عمل میں آیا تو شفیق کے خاندان کو آصف جاہی سلاطین سے بھی قریبی تعلق پیدا ہوگیا۔چنانچہ شفیق کے والد اپنی کتاب ''مآثر نظامی'' میں اپنے خاندان کا حال لکھتے ہوئے خود کو آصف جاہی، اپنے والد کو بھوانی داس غازی الدین خانی اور دادا کا نام بال کشن عابد خانی بتاتے ہیں۔

مذکورہ حقائق سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شفیق کے خاندان کو عرصہ دراز سے مسلم معاشرہ کے قریب رہنے کا موقع نصیب ہوتا رہا۔

جس کے نتیجہ میں انھیں اسلامی نظریات اور طرز معاشرت کو جاننے' بالخصوص اردو، عربی اور فارسی زبان میں اپنی صلاحیتوں کو فروغ دینے کا موقع ملا۔ جس کے اثرات شفیق کے پورے خاندان پر نظر آتے ہیں۔ شفیق کے والد رائے منسارام کو انشا اور تاریخ نویسی سے بہت دلچسپی تھی۔ ''مآثر نظامی'' کے علاوہ ان کی ایک اور تصنیف ''دربارِ آصفی'' ہے۔ جس میں انھوں نے آصف جاہی سلطنت کے اصول وضوابط کے متعلق نہایت اہم معلومات قلمبند کی ہیں۔ شفیق کے بھائی روپ نارائن ذہین بھی مقبول شاعر تھے۔ وہ عربی، فارسی اور اردو زبان میں مہارت رکھتے تھے

لچھمی نارائن شفیق ۱۱۵۸ھ م ۱۷۴۲ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ملا شیخ عبدالقادر سے عربی، فارسی اور صرف ونحو کی تعلیم حاصل کی۔ نظام علی خاں آصف جاہ ثانی نے جب اپنا پایہ تخت اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل کیا تو شفیق بھی حیدرآباد آگئے۔ وہ حکومتِ آصف جاہیہ میں عہدۂ نظارت پر مامور تھے۔ بالخصوص انھیں نواب میر احمد علی خاں اسدالملک' فرزند آصف جاہ ثانی سے تقربِ خاص حاصل تھا۔ شفیق ان کے دربار سے وابستہ تھے۔ شفیق کو ورثہ میں علمی وادبی ماحول ملا تھا' لہٰذا انھیں بچپن ہی سے اردو اور فارسی زبان پر مہارت حاصل ہوگئی تھی اور شاعری کا ذوق بھی پیدا ہوگیا تھا۔ وہ گیارہ برس کی عمر سے ہی شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ صرف سترہ سال کی عمر میں انھوں نے تذکرہ ''چمنستانِ شعرا'' مرتب کیا۔ ایک طرف شفیق کو وراثت میں علمی وادبی ماحول ملا تھا تو دوسری طرف دکن کی ذی وقار شخصیت مولانا میر غلام علی آزاد بلگرامی کے آغوشِ علم میں زانوئے علم وادب طے کرنے کا شرف بھی نصیب ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ شفیق کے فکروفن پر آزاد بلگرامی کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ شفیق نے اپنی تخلیقات میں اس حقیقت کا اعتراف بھی کیا ہے۔ شفیق کے پہلے استاد میر عبدالقادر مہرباں تھے۔ شفیق نے استاد کے کہنے پر ابتداء میں صاحب تخلص اختیار کیا تھا اور اسی تخلص کے ساتھ تقریباً دو ہزار اشعار کا ایک دیوان بھی مرتب کرلیا تھا۔ بعد میں میر غلام علی آزاد بلگرامی سے علمی فیض حاصل ہوا اور ان کی علمی استعداد وشاعرانہ صلاحیتوں میں اضافہ ہوا تو انھوں نے اس ابتدائی کلام کو تقویمِ پارینہ سمجھ کر نظر انداز کردیا اور اپنے استاد آزاد بلگرامی کی تجویز پر ''شفیق'' تخلص اختیار کیا۔ لیکن شفیق تخلص کو زیادہ تر اپنے فارسی کلام میں استعمال کیا' جب کہ اردو شاعری میں ''صاحب'' ہی استعمال کیا۔ چند ایک غزلوں میں شفیق کا استعمال بھی کیا ہے۔ تاہم انھیں شہرت شفیق کے نام سے ہی حاصل ہوئی۔ نیچے دیئے گئے اشعار میں دونوں ''تخلص'' کے استعمال کو دیکھا جاسکتا ہے۔

ہم غلامِ علی کے ہوکے غلام سر و آزاد کو غلام کیے
ریختہ کی زبان کے صاحب ہو فارسی میں شفیق نام کیے
تخلص ہے مرا ہند و دکن کے ملک میں صاحب
ولے مجھ کو شفیق اب کہتے ہیں شاعر صفا ہاں کے

شفیق نے اردو اور فارسی زبان میں دو ضخیم دیوان اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ جو ہنوز زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئے ہیں۔ ان کا فارسی دیوان ''ادارۂ تحقیقاتِ علومِ مشرق'' حیدرآباد میں موجود ہے۔ بقول ڈاکٹر لئیق صلاح: ''اردو دیوان ''دیوانِ صاحب'' کا ایک قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) میں موجود تھا۔ اب یہ نسخہ انجمن ترقی اردو (پاکستان) کے کتب خانے میں موجود ہے۔

شفیق بڑے پرگو شاعر تھے۔ انھوں نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی تھی۔ ان کی غزل کے اشعار ملاحظہ کیجئے:

دیکھتے ہیں دکھ کوئی سکھ دیکھ کر
ہم نے دیکھے دکھ ہی دکھ دیکھ کر
کس طرح بیمار دل کی ہم شفا چاہیں کہ آج
پڑ گئی ہے آس کی آنکھوں سیتی میخانے میں دھوم

شفیق کا کلام ان کی قادر الکلامی کا بین ثبوت ہے۔ انھوں نے غزلوں کے علاوہ اہم مثنویاں بھی تصنیف کی ہیں۔ ان کی مثنوی

''تصویرِ جاناں'' کوخواجہ حمیدالدین شاہد نے ۱۹۵۷ء میں مرتب کیا اور شائع کیا۔ تاہم اس مثنوی کی ترتیب واشاعت سے قبل' محمد عمر یافعی نے ''رسالہ تجلی'' کے شمارہ جنوری ۱۹۲۸ میں اسے متعارف کروایا تھا۔ مذکورہ مثنوی میں شفیق کی اردو زبان وبیان پر دسترس کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک اور مثنوی ''زراور گھونگچی کی بحث'' (مطبوعہ رسالہ اردو۔ اورنگ آباد ۔۱۹۲۸) بھی ان کی قادرالکلامی کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ شفیق کو شاعری کے علاوہ تذکرہ و تاریخ نویسی سے بھی خاص شغف تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں' مآثر آصفی (خاندانِ آصفیہ کی تاریخ)، حالاتِ حیدرآباد (حیدرآباد دکن کی مساجد، محلات، باغات کا تاریخی تذکرہ)، بسائط الغنائم (مرہٹوں کی تاریخ)، تمنیقِ شگرف (شاہانِ دہلی کی فتوحاتِ دکن اور دکن کے سلاطین کے حالات)، حقیقت ہائے ہندوستان (ہندوستان اور دکن کے صوبہ جات کی تاریخ) کے علاوہ تحفۂ احباب (اردو اشعار کی بیاض) قابلِ ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں شفیق نے دس زبانوں کی لغت ''سوس دہ زبان'' کے نام سے بھی مرتب کی تھی۔

شفیق کی غزلوں اور مثنویوں کے علاوہ ان کا بے حد اہم کارنامہ ''معراج نامہ'' کی تصنیف ہے۔ ''معراج نامہ' رسالہ ''اردو'' (اورنگ آباد)' میں جولائی ۱۹۲۷ میں شائع کیا گیا۔ اس مثنوی میں ''معراج کے واقعہ'' کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس مثنوی میں ان کا شاعرانہ کمال اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ راقمہ کو ادارہ ادبیاتِ اردو (حیدرآباد) میں مخزونہ مخطوطات میں شفیق کا ایک غیر مطبوعہ قصیدہ بعنوان ''درجواب سودا من تصنیف رائے لچھمی نارائن صاحب درنعتِ کونین' دستیاب ہوا۔ یہ ایک طویل نعت ہے۔ مذکورہ نعت میں شفیق نے معراج کے واقعہ کے پس منظر میں حضور صلعم کی شخصیت اور آپؐ کے اوصافِ حمیدہ کو بیان کیا ہے۔ شفیق کی تحریر کردہ مثنویوں میں ابتداء حمد ونعت سے ہوئی ہے۔ ان کے کلام میں جہاں جہاں ذکرِ رسول ہوا ہے وہاں ان کا قلم عقیدت کے موتی بکھیرتا نظر آتا ہے۔ خاص کر ان کی تخلیقات ''معراج نامہ' اور قصیدہ درجواب سودا'' کے مطالعہ سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضور ﷺ سے شفیق کو بڑی عقیدت تھی۔ جیسا کہ ''معراج نامہ' اور قصیدہ درجواب سودا'' کا موضوع حضور ﷺ کی مبارک شخصیت اور ''واقعہ معراج'' ہے لہذا اس موضوع پر کچھ لکھنے کے لیے سیرتِ طیبہ پر گہری نظر، تعلیماتِ رسالت سے قلبی تعلق، حضور صلعم کے معجزات و کمالات کا گہرا مطالعہ نہایت ضروری ہوتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس موضوع پر شفیق نے جس مہارت سے کلام موزوں کیا ہے اور جس طرح سے اپنے تخیل کی مدد سے ''معراج'' کے واقعہ کو قلمبند کیا ہے وہ قاری کو متحیر کرتا ہے۔ مذکورہ تحریروں کے مطالعہ سے شفیق کے پروازی خیال اور زورِ بیان پر حیرت بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ اس قصیدہ کے متعلق یوں رقمطراز ہیں۔

''اس کا موضوع نعتِ رسول عربی ہے اور اس کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہندو شاعر بھی نعت میں کتنے کامیاب شعر لکھ سکتا ہے''۔

دکن میں ''معراج نامہ'' لکھنے کا رجحان عرصہ تک رہا۔ شفیق سے قبل معظم بیجاپوری، سید میراں ہاشمی، قربی بیجاپوری، امینؔ گجراتی وغیرہ نے بھی معراج نامے لکھے تھے۔ تاہم شفیق وہ پہلے غیر مسلم شاعر ہیں جنھوں نے اس موضوع پر بڑی عقیدت اور والہانہ عشق کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے۔ شفیق کے تحریر کردہ معراج نامے میں حضور ﷺ کی مدح وثناء کا رنگ ملاحظہ کیجیے:

شان میں اوسکی ہے لولاک بنا اوسکے لیے
نقشہ ہر دو جہاں ذرہ سے خورشید تلک
طاق کسرا کا گرا اور ہوئی آتش سرد
جس گھڑی اوسکی ولادت کی پڑی جگ میں دھمک
خانہ کعبہ میں بت گر پڑے دونہیں چاہے
بھاگ جائیں اور چھپے زیر زمیں سر کو پٹک

نور اوس کا جو نہ ہوتا نہ ہوتی کونین
خلقت ارض و سماں کا ہے وہ باعث بے شک

شفیق نے جہاں حضورﷺ کی ذاتِ اقدس کے اوصاف بیان کیے ہیں وہیں ان کے کمالات میں واقعۂ معراج پر بڑی خوبصورتی اور موثر طریقہ سے اظہار خیال کیا ہے۔ واقع معراج کی رات کا سماں اس طرح سے بیان کیا ہے کہ سارا منظر آنکھوں کے آگے متحرک ہو جاتا ہے۔

سخن پر کاملوں کے کان تو دھر
نصیحت پر علی کی اب عمل کر

حضورﷺ کی صفات وکمالات کے بہترین اظہار کے باوجود شفیق خود کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ وہ سیرتِ طیبہ کی مکمل عکاسی کر پاتے۔ اپنی بےبسی کو یوں اشعار میں ڈھالا ہے۔ ملاحظہ کیجئے

صاحبؔ اب تیرے تئیں اتنی کہاں ہے قدرت
نعت میں ذات مبارک کے کہے صرف تنک
واصف اوسکا ہے خدا اس پہ ہے قرآن گواہ
کیا لب و لہجہ تجھے بے ادب اتنا نہ بہک

(قصیدہ درجواب سودا)

لچھمی نارائن شفیق کے کلام کے جائزے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نہ صرف قادرالکلام شاعر تھے بلکہ بنیادی طور پر روشن خیال فرد اور سیکولر ذہن کے مالک انسان تھے۔ انہوں نے مذہبی بنیاد پرستی سے ہٹ کر اسلام کا مطالعہ بڑی گہرائی سے کیا اور سیرتِ طیبہ کو نہ صرف بغور پڑھا بلکہ اسلام کی تعلیمات نیز حضورﷺ کی شخصیت واوصاف کو اپنے کلام میں نہایت عقیدت واحترام کے ساتھ پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ بالخصوص حضورﷺ کی شخصیت اور ان کے کارناموں سے متاثر ہو کر ان کی مدح وثناء میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔

تخلیقِ نعت کے لیے ضروری ہے کہ حضورﷺ کی محبت سے دل منور ہو اور سچ تو یہ ہے کہ یہ کسی کوتاہ ذہن شخص کے دل میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے کہا جا سکتا ہے کہ شفیق ایک وسیع القلب اور کشادہ ذہن کے مالک انسان تھے۔ شفیق نے جن موضوعات پر اظہار خیال کیا وہ نہایت ادب واحترام کا تقاضہ کرتے ہیں۔ ان موضوعات پر لکھتے ہوئے شفیق نے کہیں بھی حدِ ادب کے دائرے کو پار کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان کے اظہارِ بیاں میں عقیدت، شائستگی اور الفاظ کے انتخاب میں پاکیزگی ملتی ہے۔ خطاب کرتے وقت بھی انھوں نے لب ولہجہ کا پورا خیال رکھا ہے اور اپنے زورِ تخیل سے ''معراج'' کے واقعہ اور معجزات کو اس خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ حضورﷺ کا سراپائے مبارک، معراج کی رات کی رونقیں اور معجزات کو ہم اپنے چشمِ تصور میں محسوس کر سکتے ہیں۔ شفیق کی یہ انفرادی خوبی نہ صرف انہیں دوسرے شعراء سے ممتاز حیثیت بخشتی ہے بلکہ ماضی کے ہندوستان کی خوبصورت مشترکہ تہذیب اور روایات کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر امینہ تحسین
صدر شعبہ تعلیم نسواں، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
گچی باؤلی، حیدرآباد 032 500 (تلنگانہ)
موبائل:9885017580

اردو کے کہنہ مشق غیر مسلم سخن ور: ڈاکٹر کے. مدنا منظؔر

کرناٹک کے ممتاز شاعروں میں کے مدنا منظؔر کا شمار ہوتا ہے۔ مدنا نام، منظؔر تخلص ہے۔ مدنا منظؔر 9/اکتوبر 1920ء کو تماپور، رنگم پیٹھ تعلقہ شوراپور، ضلع گلبرگہ کے ایک علمی لنگایت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پر بھوراؤ تماپوری پیشہ تدریس سے وابستہ تھے اور اردو و فارسی میں دسترس رکھتے تھے۔ منظؔر کی ابتدائی تعلیم شوراپور میں ہوئی گلبرگہ سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ میڈیکل کالج حیدرآباد سے ایم بی بی ایس 1948ء میں اور بمبئی سے ایم ایس کامیاب کیا۔ 1988ء میں نئی دہلی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی اور پھر ڈی لٹ کلیفورنیا، امریکہ سے کیا۔ محکمہ صحت وطبابت سے وابستہ ہوگئے۔ بیجاپور اور رائچور سے بحیثیت سرکاری (ڈاکٹر) سیول سرجن ایک عرصہ تک کارگزار رہے۔ قطعی غیر شاعرانہ پیشے اور یکسر مریضانہ ماحول میں رہتے ہوئے بھی ادب سے شغف اور شاعری سے اپنا ناطہ استوار کیا۔ بحیثیت ڈپٹی ڈائرکٹر آف فارمیسی وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے اور بنگلور کو اپنا وطن ثانی بنالیا اور یہیں سے شعروادب کی خدمت میں مصروف ہوگئے۔ شاعری میں وہ شور عابدی گلبرگہ اور حبیب اللہ حبیب رائچوری سے شرف تلمذ رکھتے تھے۔ مدنا منظؔر نے شعرگوئی کا آغاز 1960ء کے بعد شروع کیا۔ وہ بیک وقت متعدد زبانوں پر مہارت رکھتے تھے۔ پیشہ کے لحاظ سے ایک سیول سرجن تھے لیکن روح کے طبیب بھی تھے یعنی وہ ایک متصوفانہ شاعر تھے۔ سلیمان اریؔب مدیر 'صبا' لکھتے ہیں ''ایک ڈاکٹر کا ایک صاحب دل ہونا بڑا عجیب لگتا ہے لیکن میرے نزدیک منظر صاحب کی شاعری میں جو سوز و گداز آگیا ہے وہ ان کے دل اور ''پیشہ'' کی دین ہے'' (مدنا منظؔر، منظر عرفان، 1967ء، حیدرآباد، ص:3)۔ شاعری میں ان کے چھ مجموعۂ کلام زیور طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں:

''آئینۂ عرفان'' (انتخاب کلام)، ''عرفان سخن'' (انتخاب کلام) (1965ء)، ''منظر عرفان'' (1967ء)، ''حسن عرفان'' (کلیات) (1970ء)، ''منظر بہ منظر'' اور ''تجلیات'' (کلیات) (1993ء)

ان مجموعوں میں غزلیں، نظمیں، قطعات، نعتیں، منقبتیں، فردیات وغیرہ شامل ہیں۔ مدنا منظؔر کو اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی اور کنڑی زبانوں میں شعر کہنے کا ملکہ حاصل تھا۔ انگریزی میں ''Blue Eyes'' کے نام سے شعری مجموعہ طبع کیا۔ ہندی میں دو شعری مجموعے ''رس گنگا'' اور ''نیل کمل'' شائع کیے اور کنڑی زبان میں پانچ شعری مجموعے ''پربھودرشن''، ''مدھرویدنا''، ''ترشول''، ''دہنی گلو'' اور ''کرن وینا'' ہیں۔ انھیں مختلف انجمنوں اور اداروں نے کئی انعامات، اعزازات اور خطابات سے نوازا۔ وہ 'بزم ادب' رائچور (کرناٹک) کے صدر، انجمن ترقی اردو ہند کی مرکزی عاملہ بنگلور کے سرپرست اور کرناٹک اردو اکادمی میں بحیثیت رکن خدمات انجام دے چکے ہیں۔ مدنا منظؔر کی صدارت میں ''بزم ادب'' کی کاروائیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے قدوس ناظم رقم طراز ہیں:

''بزم ادب، ضلع رائچور کا کاروان ادب جناب ڈاکٹر مدنا منظؔر کی رہنمائی میں علم وعرفان، تہذیب وتاریخ، شعروادب کی وسیع اور روشن بلندیوں سے گزر رہا ہے اس بزم کے تحت علمی وادبی محفلیں، سمپوزیم، مشاعرے ہوتے رہتے ہیں اور پھر وقتاً فوقتاً کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں۔'' (عرفان سخن، ص:5)

مدنا منظؔر ہند لمانی تہذیب کے علم بردار شاعر ہیں جن کا مسلک انسانیت ہے وہ نہایت سادہ اور پرخلوص شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ نہایت منکسر المزاج، حساس، ہمدرد، انتہائی جذباتی اور درویش صفت واقع ہوئے تھے۔ دنیاوی نمائش اور زیبائش سے

مضامین

گریز کیا کرتے تھے۔ وہ ایک ہندوگھرانے سے تعلق رکھتے تھے لیکن اردو سے ان کی انسیت ومحبت اور اسلامی تصوف سے ان کا عمیق لگاؤ وشغف بقول سلیمان اریبؔ اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔

ع پروانہ چراغ حرم ودیر نہ داند! (منظر عرفان،ص:3)

انھوں نے تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ نعت نہایت عقیدت سے کہتے تھے نعتیہ کلام میں پورے ادب اور احترام کو ملحوظ رکھا ہے۔ جس طرح بڑی عقیدت سے لکھتے اسی طرح بڑے احترام سے پڑھتے تھے۔ اس صنف میں انھوں نے شہرت ومقبولیت پائی۔ مدنا منظرؔ کا شمار اردو کے نعت گوشعراء میں ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں سید عبداللہ مدیر ماہنامہ ''جستجو'' حیدرآباد لکھتے ہیں:

''خوش نصیبی سے منظرؔ صاحب کو یہ خزانہ اپنے والد جناب پربھوراؤ۔۔۔تماپوری سے ورثہ میں ملا ہے، جن کی عام علمی خدمات یقیناً قابل استحسان ہیں اور بالخصوص کنڑی زبان میں موصوف نے قرآن مجید کا جو ترجمہ کیا ہے، یہ ان کا عظیم کارنامہ ہے۔ چنانچہ منظرؔ صاحب نے بھی اپنے والد بزرگوار کی جانشینی کا بہترین ثبوت ہی نہیں بلکہ حقیقت میں حسین ترین حق سبحانہٗ وتعالیٰ سے بے انتہا عبدیت ومحبت اور سرور کائنات آنحضرت صلعم سے نہایت درجہ دلگدازانہ عشق اور حسن عقیدت کو اپنے اس نعتیہ کلام میں ع ''جوروح کوتڑپانے اور قلب کوگرمانے'' (کذا) کا اثر رکھتا ہے (کذا)۔''منظر عرفان'' میں پیش کیا ہے۔ بلاشک وشبہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی شان ہے کہ جس نے جو اور جیسا بننا (کذا) چاہا، اس کو ویسا بنا دیتے ہیں۔ ع

''پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے'' یہ ایک حقیقت ہے''

(منظر عرفان،ص:4)

منظرؔ کے کلام میں صوفیانہ عناصر نمایاں ہیں۔ علاوہ ازیں بھائی چارگی، انسان دوستی یکجہتی اور وطن پرستی کا جذبہ بھی ملتا ہے۔ ان کا یہ مشہور شعر ملاحظہ ہو ۔

پابند مقدر ہو کر بھی ہر چیز پہ قادر ہے انساں
مجبور کا جب یہ عالم ہے مختار کا عالم کیا ہوگا

''آئینۂ عرفان'' کے مطالعہ کے بعد حبیب رائچوری اپنا تاثر یوں پیش کرتے ہیں:

''۔۔۔انسان حقیقت میں عشق ومحبت کی مخمور تصویر ہے۔۔۔۔نظر نظر نہ رہے، دل دل نہ رہے تو انسانی وجود ایک مجسمہ بن کر رہ جائے۔۔۔۔۔ بہرحال اس کتاب کا ہر شعر گنجینۂ حق کی کلید ہے۔ سوز وگداز، عشق ومحبت کا جلتا ہوا چراغ شبستان ہے جس کی روشنی گمراہوں کو شہ راہ آفتاب سے ملادینے کے لیے بے چین ہے۔''

''عرفان سخن'' کے سرسری جائزے کے بعد وقار خلیل (سب رس، حیدرآباد) اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے: ''منظرؔ ہندوستانی روحانیت کے فلسفہ سے نہ صرف کماحقہٗ واقف ہیں بلکہ ان کی فکر رسا نے ہندی دھرموں اور مذہبوں کا مطالعہ قومی ایکتا اور اتحاد کو اساس بنا کر کیا ہے اور مذہب کو انھوں نے افیون نہیں سمجھا۔ بلکہ اسے دین اور دنیا دونوں کی بہتری اور بھلائی کا پیش خیمہ جانا۔ مذاہب کو ''تفریق'' اور ''فصل'' پیدا کرنے والی چیز نہیں جانا بلکہ ''وصل'' اور ''اتحاد'' کا سرچشمہ سمجھا۔'' (عرفان سخن،ص:8)

عرفانی تڑپ کے لئے درد وگداز وسوز نہاں ناگزیر ہے۔

ملا ہے درد مجھے دل کے آبگینے میں
چراغ طور ہے ہر داغ میرے سینے میں

مدنا منظرؔ کے کلام میں بلا کی معنویت، اوزان کی آزادی و پابندی، فن کے ساتھ ساتھ جذب ومستی، کیف وسرود، حسن الفاظ کی ترتیب میں کمی بیشی، بلندیٔ فکر وتخیل اور درد و سادگی کی شدت پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی غزلوں میں بڑی چابک دستی کے ساتھ لفظی صنائع موجود ہے۔ قطعات نہایت شستہ وپرلطف ہیں۔ ان کے کلام میں تشبیہات واستعارے زیادہ نہیں۔ منظر نگاری وواقعہ

مضامین

نگاری بہت ہے۔ جذبات و کیفیات کی تصویر کشی و دلی جذبات کی عکاسی خوب کرتے ہیں۔

مجاز مشیر ''بزم ادب''، رائچور لکھتے ہیں: ''منظر نے بعض شعر انتہائی چونکا دینے والے کہے ہیں۔ وہ زندگی سے مایوس نہیں ہیں مگر زندگی سے اُنس بھی نہیں رکھتے۔ وہ تصوف کے مدارج طے کرکے عرفان کی وادی میں کھو گئے ہیں۔ وہ ایک ایسے قطرے کی مانند ہیں جو دریائے وحدت سے الگ ہوکر پھر اسی میں شامل ہونے میں رواں دواں ہیں۔ وہ اپنے وجود کو مٹا کر ''کل''میں ضم ہوجانا چاہتے ہیں۔ قطرہ کو دریا بننے کے لیے ایک فرصت چاہیے۔ شاید منظر کی یہ ریاضت ان کے کام آجائے اسی مقام پر پہنچ کر شاعر چیخ اٹھتا ہے۔

منظر انھیں پہنچادے میں جس کی امانت ہوں
اک بار تو ہستی کا ہلکا میرا ہونے دے''

(آئینۂ عرفان، ص:6، 26)

منظر نے عرفان و تصوف میں شائستہ اور نفیس اسلوب کا حق ادا کیا۔ ان کے مجموعوں میں حمد سے آغاز ہوا ہے اور اس کے بعد نعت شریف درج ہے۔ مدنا منظر نعت خوب لکھتے ہیں ملاحظہ ہو۔

اس صادق و امین کی مساوات دیکھیے
ہندو نظر میں ہے نہ مسلماں نظر میں ہے
جو ظلمتوں سے پاک زمانے کو کر گیا
ماہ عرب و مہر درخشاں نظر میں ہے
وحدانیت کی سب کو وہ تعلیم دے گیا
اُمی لقب و صاحبِ قرآں نظر میں ہے

پوری نعت بے پناہ بلیغ وخلوص کی مظہر ہے۔ انسانیت، مساوات اور وحدانیت کے موضوع وسیع کو منظر نے بہت عمدگی و خوبصورتی سے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں واضح کردیا۔ شعر دیکھیے:

عشق کی دولت نہ نذر اشک ہوجائے کہیں
فرط غم پر ضبط کو فرماں رواں رکھتا ہوں میں

ان کا کلام زندگی کی عظمتوں و رفعتوں سے مملو ہے۔

ان کا کلام قدیم رنگ سخن کا آئینہ دار ہے، ان کی شاعری قلبی محسوسات اور کیفیات کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اسے اخلاقی اقدار، نصیحتیں اور تصوفانہ عناصر، عرفانیت کی مہک، تصوف اور ویدانیت کی چاشنی، روح کی لذّت اور خلوص وفا و محبت کی خوشبو، قدرت کی بڑائی وعظمت، زندگی کی حرکت، نیرنگی، شیرینی (کم زیادہ)، ہندوستانی روایات کا معطر گلدستہ کہا جاسکتا ہے۔

ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے سید مخدوم حسینی خیر رضوی رقم طراز ہیں: ''منظر صاحب کے کلام میں صدق وخلوص کی دھڑکنیں بکھری ہوئی ہیں۔ فی الواقع اس میں جوئے نشاط کی سی روانی، طائران خوشنوا کی سی نغمگی، پھولوں کی سی شگفتگی ہے۔ تصوف کے رنگ میں اسرار خودی اور رموز بے خودی کی گتھیوں کو سلجھاتے نظر آتے ہیں۔

اک سمت ہے زمانہ ایک سمت بادہ خانہ
دونوں کی کشمکش میں اے دل بھٹک نہ جانا''

(عرفان سخن، ص:13)

ڈاکٹر مدنا منظر کا شمار دکن کے ممتاز غیر مسلم اردو شعرا میں ہوتا ہے۔ انھوں نے غزل، نظم اور دیگر اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن ان کی شہرت ومقبولیت ان کی نعتیہ شاعری کی بدولت ہے۔ غیر مسلم ہوتے ہوئے بھی انھوں نے جس عقیدت اور والہانہ جذبے سے نعتیں لکھی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر حکیم رئیس فاطمہ
وزیٹنگ اسپیکر، ایس آئی پی،
یونی ورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد
موبائل نمبر 9948125832

اردو کے ممتاز فکشن نگار: پنڈت سدرشن

سدرشن اردو کے ابتدائی نمایاں افسانہ نویسوں میں ہیں جو مابعد پریم چند کامیابی کے ساتھ دنیائے افسانہ میں مقبولیت اور شہرت حاصل کررہے تھے۔ سدرشن نے ناول اور ڈرامے بھی لکھے اور صحافت سے دلچسپی بھی لی لیکن افسانہ نویسی کی بنا پر انھیں شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ سدرشن 1895ء میں سیالکوٹ، پنجاب میں پیدا ہوئے تھے۔ (جگدیش مہتا درد۔ اردو کے نان مسلم شعراء وادیب حصہ دوم، 1980ء، نئی دہلی، ص: 503) ان کے آباواجداد نے کشمیر سیالکوٹ (پنجاب) آکر سکونت اختیار کی تھی۔ سدرشن کے والد کا نام گوران وتامل اور والدہ کا نام یمنا دیوی تھا۔ وہ ایک برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا پورا نام پنڈت بدری ناتھ تھا۔ انھوں نے افسانہ نگاری شروع کی تو اپنا قلمی نام ''سدرشن'' اور ''مہاشہ سدرشن'' رکھا۔ پانچ سال کی عمر میں اسکول میں داخل ہوئے اور ''اینگلو ورنا کیولر اسکول'' سیالکوٹ سے مڈل پاس کیا اور اس کے بعد اسکاٹ مشن ہائی اسکول اور مشن کالج سیالکوٹ سے ہائی اسکول اور ایف اے کامیاب کیا۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ رقم طراز ہیں کہ سدرشن نے پنجاب یونی ورسٹی، لاہور سے بی۔اے کی سند حاصل کی تھی (اردو افسانے کی روایت، 1991ء، اسلام آباد، پاکستان، ص: 271) سدرشن نے تیرہ سال عمر میں لکھنا شروع کیا ان کا پہلا افسانہ 'سدابہار پھول'' تھا۔ یہ افسانہ سدرشن نے 1912ء میں قلم بند کیا تھا جب ان کی عمر سولہ برس کی تھی۔ (ایضاً، ص: 271) وہ آریہ سماج سے وابستہ تھے۔ سدرشن کی شادی 1915ء میں بٹالہ شریف کے ایک معزز گھرانے میں لیلاوتی سے ہوئی۔ 1913ء میں سیالکوٹ سے لاہور آئے ان کی ادبی سرگرمیوں کا مرکز لاہور رہا۔ اور اخبار ''دیش'' کی مجلس ادارت میں شامل ہوگئے۔ اس ادارے سے انھیں 45 روپئے ماہوار ملتے تھے۔ 1916ء میں ''چندر'' ہفتہ وار اخبار نکالا لیکن مالی دشواریوں کی وجہ سے اسے بند کرنا پڑا۔ اس کے بعد وہ ''جاٹ گزٹ'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ سدرشن کو صحافت کا تجربہ تھا۔ انھوں نے احمد شجاع کے اخبار ''حق'' کی ادارت کے فرائض انجام دیے تھے۔ 1922ء میں بنارس جا کر سرسوتی پریس قائم کیا۔ 1927ء میں معاش کی تلاش میں لاہور سے کانپور آئے یہاں سدرشن کو ''لال املی'' کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ ان دنوں سدرشن کی ملاقات منشی پریم چند اور دیا نرائن نگم ایڈیٹر ''زمانہ'' کانپور سے ہوئی۔ 1930ء میں ''لال املی'' کمپنی میں ملازمت سے علٰحدہ کردیے گئے اور بنارس سے ادبی مجلّہ ''ہنس'' جاری کیا اور سدرشن پبلشنگ ہاؤس قائم کیا۔ 1931ء میں ماہنامہ رسالہ ''چندن'' لاہور سے جاری کیا۔ 1932ء میں سدرشن کلکتہ پہنچے تنگ دست رہے مختلف کتب کے تراجم کرکے روزی کمائی اور 1939ء میں پارسی تھیٹریکل کمپنی نے ماہانہ مشاہرے پر انھیں ڈرامے لکھنے کا کام سپرد کیا۔ یہاں انھوں نے اپنا ڈرامہ ''مزدور'' پیش کیا۔ ڈراما جب اسٹیج کیا گیا تو بہت مشہور ہوا۔ وہ نیو تھیٹر (کلکتہ) فلمی دنیا سے وابستہ ہوگئے اور انھوں نے کئی فلموں کے لیے کہانیاں، اسکرین پلے، گیت اور مکالمے لکھے۔ ان میں ''رامائین''، ''کماری ودھوا''، ''دھوپ چھاؤں''، ''پتھروں کا سوداگر''، ''دشمن''، ''گراموفون سنگر''، ''بھاگ چکر''، ''پردیسی''، ''سکندر''، ''چندرلیکھا'' اور ''پڑوسی'' وغیرہ ان کی باقیات ہیں۔ ڈراما ''محبت کا انتقام''، پر حکومت پنجاب

مضامین

نے پانچ سو روپئے انعام سے نوازا۔ 1947ء میں ہجرت کر کے بمبئی منتقل ہوگئے۔ یہاں انھوں نے اپنے فرزند شاش بھوشن کے ساتھ بمبئی میں مستقل بود و باش اختیار کی۔ آخری دور میں پنڈت سدرشن بعض موذی بیماریوں کا شکار ہوگئے۔ 16/دسمبر 1967ء بمقام بمبئی داغ مفارقت دے گئے۔ (اردو کے نام مسلم شعراء و ادیب، حصہ دوم، ص:508)

تصانیف: سدرشن کا شمار اوّلین ترقی پسند ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کے مطبوعہ کتب حسب ذیل ہیں:

سدرشن کے افسانوں کے مجموعوں میں ''سدا بہار پھول''، ''چندن''، ''قوس قزح''، ''آزمائش اور دیگر افسانے''، ''طائر خیال''، ''بہارستان''، ''چشم و چراغ''، ''سولہ سنگھار'' اور ''صبح وطن'' شامل ہیں۔ ان کے طبع زاد ناولوں میں ''پتھروں کا سوداگر''، ''کنج عافیت'' اور ''آنریری مجسٹریٹ'' (فکشن)

ان کے ڈراموں میں ''محبت کا انتقام'' (باتصویر)، ''اندھے کی دنیا'' (تین ایکٹ کا ڈراما)، ''سنگیت مہابھارت''، ''پربلا''، ''راجپوت کی شکست''، ''چھایا''، ''گناہ کا پرائشچت کنڈ'' (چار جلدیں) اور ''رستم وسہراب'' (بچوں کے لیے) شامل ہیں۔

ان کے ادبی مضامین کے مجموعوں میں ''چٹکیاں''، ''من کی موج'' اور ''پریم چالیسی'' (دو جلدیں) ایک تذکرہ ''گلدستہ سخن'' (1922ء) اردو شاعری کی مختصر تاریخ معہ شعراء کے حالات زندگی و انتخاب کلام پر مشتمل ہے۔ سدرشن ایک اچھے مترجم ہیں انھوں نے متعدد تصانیف کے ترجمے بھی کیے۔ جیسے ''بنگال بتیسی'' (دو جلدیں) [یہ کتاب بنگالی کہانیوں کا انتخاب و ترجمہ ہے] ''وجے سنگھ'' (بنگالی ناٹک کا ترجمہ)، ''عورت کی محبت'' (بنگالی ناٹک کا ترجمہ)، ''گناہ کی بیٹی'' (ناول/ بنگالی سے ترجمہ)، ''راج سنگھ'' (بنگالی ناول کا ترجمہ)، ''قدرت کا کھیل'' (ناول/ترجمہ)، ''تہذیب کے تازیانے'' (بنگلہ سے ترجمہ)، ''زہریلا آب حیات'' (بنگلہ سے ترجمہ)، ''بے گناہ مجرم'' (ناول/ترجمہ)، ''قوم پرست'' (بنگلہ ناٹک کا ترجمہ)، ''رشی دیانند'' (ڈراما/ترجمہ)، ''خوش انجام'' (ترجمہ)، ''بچوں کے لیے ہتوپدیش'' (ترجمہ)، ''بچوں کے لیے مہابھارت'' (ترجمہ)، ''بچوں کے لیے رامائن'' (ترجمہ)

مذکورہ بالا بیشتر تراجم بنگالی سے اردو میں ہیں۔ ان میں ڈرامے اور ناول کی کثرت ہے۔ دیگر تصانیف میں ''پریم چالیسی'' (دو جلدیں)، ''امرت'' (بچوں کے لیے)، ''ہمارے رشی کی پیاری باتیں'' (اخلاقیات)، ''پارسی'' (بچوں کے لیے) اور ''پھول وتی'' (بچوں کے لیے) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ سدرشن نے ادب اطفال پر بھی خاص توجہ دی ہے۔ علاوہ ازیں ''راج سنگھ'' (دہلی) اور ''اندھے کی دنیا'' (بمبئی) سے ان کے علاوہ ما باقی تمام کتب لاہور سے طبع ہوئیں۔

سدرشن نے اردو میں ایک سو سے زائد کہانیاں لکھیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ وہ ہندی میں بھی کہانیاں لکھتے رہے۔ مختلف اصناف اور متنوع موضوعات پر ان کی کئی تصانیف زیور طباعت سے آراستہ ہوئیں۔

سدرشن ایک حقیقت پسند افسانہ نویس تھے۔ انھوں نے رومانی دھندلکوں اور تخیل کی سنہری دنیا پر ہندوستان کی دیہاتی اور شہری زندگی اور متوسط طبقے کے مسائل کو مرکز توجہ بنایا۔ سدرشن کے افسانوں میں ان کی وطن پرستی، انسان دوستی اور اس کے مسائل کے ادراک کا عکس موجود ہے۔ سدرشن سے پہلے پریم چند نے ہندوستان کے دیہاتوں، کسانوں اور مل مزدوروں کے مسائل پر افسانے اور ناول لکھے تھے۔ سدرشن کے پیش نظر پریم چند کی

کہانیاں تھیں وہ ان سے متاثر تھے اور ابتدا میں انھیں کی حوصلہ افزائی سے سدرشن پابندی سے کہانیاں لکھنے لگے۔ سدرشن بھی زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو اپنے تحریروں کا موضوع بناتے رہے۔لیکن انھوں نے دیہات کے بجائے شہری زندگی کو ترجیح دی اوران موضوعات کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

اس دور کے ہندوستانی حالات و خیالات کا عکس سدرشن کی کہانیوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ بقول اختر انصاری پریم چند کے بعداردو افسانے میں اہم اورنمایاں مقام سدرشن کو حاصل ہوا۔ (اردو فکشن بنیادیں وتشکیلی عناصر 1974ء ،ص: 213) سدرشن کے افسانوں کا پرتاثرعنصران کی عمدہ قصہ گوئی ہے۔ان کے پلاٹ مربوط اورمنظم ہوتے ہیں اس لیے ہر قدم پر قاری کا اشتیاق بڑھتا جاتا ہے۔سدرشن کے افسانوں کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی کردار نگاری ہے۔وہ اپنے کرداروں کے وسیلے سے زندگی کے مختلف تجربات اور ان سے متعلق انسانی ردعمل کا بڑی کامیابی سے تجزیہ کرتے ہیں۔ان کے کردار فطری اور مستحکم معلوم ہوتے ہیں۔ سدرشن نے کبھی دیہاتی ماحول، دیہاتی زندگی وواقعات تو کبھی شہری زندگی وحالت کی عکاسی کی ہے۔عموماً امیروں اورغریبوں کی زندگی کا موازنہ ان کی کہانیوں کا مقصد ہوتا ہے اوران کے پس منظر میں انسانی کشمکش اور جدو جہد کا جائزہ لیا ہے جس کے پیش نظر بقول وقارعظیم سدرشن کے افسانے دوسروں سے مختلف ہیں۔(فن افسانہ نگاری، ص:138) پریم چند کی طرح سدرشن کو بھی منظر کشی سے لگاؤ ہے اور کہانی وواقعہ کا پس منظر پیش کرنے میں مہارت حاصل ہے۔ان کی نثر میں پریم چند کی طرح محاکاتی پہلو موجود ہیں۔سدرشن نے اپنی کہانیوں میں بقول عبداللہ متوسط ہندوگھرانے کی شہری زندگی کو اپنا موضوع بنایا ہے اوران کے مسائل پیش کیے ہیں۔(اردو ادب کی ایک صدی،ص:183)

سدرشن کی افسانہ نویسی مقصدی ہے۔ان کی کہانیوں میں بھائی چارگی، مساوات، اخوت اتحاد اور احترام آدمیت کے درس کے ساتھ محبت خلوص، دردمندی اور نیکی کے جذبات بھی کارفرما ہیں۔ وہ مکالموں میں اختصار اور بے ساختہ اسلوب کے شیدا ہیں۔سدرشن کے افسانوں کی ایک اوراہم خوبی سادگی ہے۔ بقول ڈاکٹر سیداعجاز حسین ''زبان میں سادگی، بیان میں سادگی اور خیال میں سادگی'' (تاریخ ادب اردو، ترمیم شدہ، 1984ء، الہ آباد، ص:362) سدرشن کی زبان سادہ، سلیس اوران کا اسلوب بیان دلکش اورنہایت سیدھا ہے۔انھیں انسانی جذبات کی مرقع کشی میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ ان کے افسانوں میں انسانی فطرت و نفسیاتی امور کا عمیق نقش ملتا ہے۔انسان کی داخلی کشمکش کو سدرشن نے بڑی دیدہ وری، بصیرت اور بے حد فطری انداز میں پیش کیا ہے۔سدرشن نے دیہاتی زندگی کے واقعات پر بھی کہانیاں لکھیں اوراپنے افسانوں میں انسانی نفسیات کی ترجمانی بھی کی ہے۔

سدرشن اردو کے ان چند نمایاں مختصر افسانہ نویسوں میں ہیں جو پریم چند کی طرح اپنے سماجی واصلاحی افسانوں کی خوبی اوران کی دلکشی اور اسلوب بیان کی وجہ سے اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر نشاط احمد
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو،
یونی ورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد
موبائل نمبر 9948111687

پریم چند کا تعارف وتصانیف سنین کے پس منظر میں

پریم چند اردو ادب کے ایسے مایہ ناز افسانہ نگار، ناول نویس اور ادیب گزرے ہیں کہ جن کی نگارشات گیرائی اور گہرائی کے سبب اردو ادب میں ایک منفرد مقام رکھتی ہیں؛ موصوف جس موضوع پر قلم اٹھاتے اس کا حق ادا کر دیا کرتے تھے؛ چناچہ وہ اردو کے افسانوی ادب کے عہد ساز ادیب کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا، ان کے چچا مہابیر رائے نے عرفیت ,,نواب رائے،، دی تھی؛ انھوں نے ۳۱/جولائی ۱۸۸۰ء کو بنارس کے لمہی گاؤں میں کائیستوں کے سریواستو قبیلے میں منشی عجائب لال کے گھر میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد کسان ہونے کے علاوہ ڈاک خانے میں ملازمت بھی کیا کرتے تھے؛ والدہ آنندی دیوی سگھڑ خاتون تھیں۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق پریم چند کی ابتدائی تعلیم اردو اور فارسی میں ہوئی؛ ابھی لڑکپن کے عہد سے گزر رہی رہے تھے کہ والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، والد کے تبادلوں اور سوتیلی ماں کے سلوک نے انھیں زندگی کے تلخ تجربات سے دوچار کیا؛ مستزاد ہائی اسکول کی تعلیم کے دوران کسی اندیشہ ہائے دورودراز کے سبب ان کے والد نے ان کی شادی کر ڈالی؛ جس سے وہ کبھی خوش نہیں تھے۔ والد کے دیہانت کے بعد گھر کی تمام تر ذمے داریاں پریم چند کے کندھوں پر آ گئی اس کے باوجود بھی انھوں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور میٹرک کا امتحان کامیاب کیا؛ اس کے بعد ملازمت کی تگ ودو میں لگے رہے اور جب معلم کی اسامی پر تقرر ہوا تو انھیں دو سال تک ٹیچر ٹریننگ دی گئی؛ یہیں سے ان کے ادبی سفر کا آغاز ہوا۔

پریم چند نے ۱۹۱۹ء میں الہٰ آباد یونی ورسٹی سے بی۔ اے۔ کی سند لی؛ اس طرح ۱۹۲۱ء میں انھیں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس کے عہدے پر ترقی دی گئی؛ لیکن اسی سال وہ اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے کر مہاتما گاندھی کی تحریک سے جڑ گئے۔ اُن دنوں ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت عروج پر تھی، فرنگی تہذیب اور مغربی علوم کی یورش نے لوگوں کے دماغوں کو کچھ اس طرح مرعوب کر دیا تھا کہ وہ مشرقی علوم اور تہذیب سے کنارہ کش ہونے لگے تھے۔ پریم چند نے اپنی قوم کو اس بے راہ روی سے باہر نکالنے کے لیے میدان صحافت میں قدم رکھا اور وہ کان پور کے ماہنامے ,,زمانہ،، میں نواب رائے کے نام سے کالم لکھتے رہے اور جب ان کا افسانوی مجموعہ ,,سوز وطن،، شائع ہوا تو اسے انگریزی حکومت نے نہ صرف ضبط کیا بلکہ اسے نذرِ آتش بھی کر دیا؛ جب حالات نے حق گو اخبار نویسوں کی زبانوں پر تالا ڈالنے کی کوشش کی تو انھوں نے کچھ عرصے تک پیشۂ صحافت کو خیر باد کہہ کر ایسی مصروفیت میں سرگرداں رہے جس میں انھیں پڑھنے لکھنے کا موقع ملے اور ان کے ذوق کی تکمیل ہو، مرورِایام ماہ نامہ زمانہ کے ایڈیٹر دیا نرائن نگم نے انھیں قلمی نام ,,پریم چند،، اختیار کرنے کا مشورہ دیا؛ جس کو انھوں نے قبول کیا اور اپنی آخری سانس یعنی ۸/اکتوبر ۱۹۳۶ء تک اسی نام سے لکھتے رہے اور آج بھی وہ اردو، ہندی حلقوں میں پریم چند کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

پریم چند نے یوں تو بہت کم عمر پائی؛ اس کے باوجود اگر ہم ان کے ادبی سرمائے پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف افسانے لکھے بلکہ موصوف نے کئی ناول اور خاکے بھی سپردِ قلم کیے؛ علاوہ ازیں پریم چند نے مضامین، تبصرے، خطوط، مراسلے نیز اداریے وغیرہ سبھی کچھ لکھ چھوڑے ہیں؛ ان

کی تحریروں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ ہر مسئلے کا نہایت عمیق نگاہی سے مطالعہ کرتے اور دوررس نتائج سے قاری کے ذہن وفکر کو محظوظ کرتے ہیں۔ انھوں نے بڑے معرکے کے مضامین، تقاریظ، افسانے اور ناول لکھے اس طرح انھوں نے اردو افسانوی اور غیر افسانوی ادب کا معیار بلند سے بلند تر کر دیا یہی نہیں بلکہ انھوں نے عوام میں خود شناسی اور بے داری کی ایک عام تحریک پیدا کر دی؛ اس طرح پریم چند کئی کتابوں کے مصنف ہوئے، افسانوں؛ ناولوں؛ خاکوں اور ڈراموں پر مشتمل ان کے حسب ذیل مجموعے شائع ہو چکے ہیں:

(۱) ۱۹۰۳ء میں پریم چند نے اپنا پہلا ناول ,,اسرارِ معابد،، نواب رائے کے نام سے لکھا جو ہفت وار اخبار ,,آوازہ خلق،، بنارس میں بالاقساط شائع ہوا اور یہ افسانہ نامکمل ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہوتا ہے کہ ناول کا موضوع عبادت گاہ سے متصف ہے؛ پریم چند نے اس ناول میں عوام کے اعتقادات سے فائدہ اٹھا کر کس طرح مندروں میں استحصال کیا جاتا ہے اس پر کاری ضرب لگانے کی کوشش کی ہے۔

(۲) ۱۹۰۷ء میں پریم چند کا ناول اردو میں ,,ہم خرما وہم ثواب،، اور ہندی میں ,,پریما،، کے نام سے شائع ہوا۔

اس ناول میں پریم چند نے معاشرے میں موجود برائیوں پر ضرب لگاتے ہوئے بیوہ خواتین کی دوبارہ شادی کیے جانے پر زور دیا ہے۔

(۳) ۱۹۰۷ء میں پریم چند نے ,,روٹھی رانی،، کے عنوان سے ایک ناولٹ لکھا۔

(۴) ۱۹۰۸ء میں پریم چند نے اپنا پہلا افسانہ ,,عشقِ دنیا اور حب وطن،، نواب رائے کے نام سے ماہ نامہ ,,زمانہ،، کان پور سے شائع کرایا۔

(۵) ۱۹۰۸ء میں ہی پریم چند نے اپنا پہلا افسانوی مجموعہ ,,سوزِ وطن،، نواب رائے کے نام سے شائع کرایا۔

(۶) ۱۹۱۰ء میں ان کی پہلی کہانی ,,بڑے گھر کی بیٹی،، شائع ہوئی۔

(۷) ۱۹۱۲ء میں پریم چند کا پہلا ناول ,,جلوہ ایثار،، شائع ہوا۔

(۸) ۱۹۱۵ء میں پریم چند نے اپنا دوسرا افسانوی مجموعہ ,,پریم پچیسی،، حصہ اول شائع کرایا۔

(۹) ۱۹۱۶ء میں پریم چند کا ناول اردو میں ,,بازارِ حسن،، اور ہندی میں ,,سیوا سدن،، کے نام سے شائع ہوا ہے۔

(۱۰) ۱۹۱۸ء میں پریم چند نے اپنا دوسرا افسانوی مجموعہ ,,پریم پچیسی،، کا دوسرا حصہ شائع کرایا۔

(۱۱) ۱۹۲۰ء میں پریم چند نے افسانوی مجموعہ ,,پریم بتیسی،، کا پہلا حصہ شائع کرایا۔

(۱۲) ۱۹۲۰ء میں ہی کچھ عرصے کے بعد پریم چند نے افسانوی مجموعہ ,,پریم بتیسی،، کا دوسرا حصہ شائع کرایا۔

(۱۳) ۱۹۲۰ء میں پریم چند کا ناول ,,گوشہ عافیت،، شائع ہوا؛ جس کا ہندی نام ,,پریم آشرم،، ہے۔

(۱۴) ۱۹۲۲ء میں پریم چند کا ناول ,,نرملا،، شائع ہوا؛ جس کا ہندی نام بھی ,,نرملا،، ہی ہے۔

(۱۵) ۱۹۲۵ء میں پریم چند کا ناول ,,پردہ مجاز،، شائع ہوا؛ جس کا ہندی نام ,,کایا کلپ،، ہے۔

(۱۶) ۱۹۲۷ء میں پریم چند کا ناول ,,بیوہ،، شائع ہوا؛ جس کا ہندی نام ,,پرتگیہ،، ہے۔

(۱۷) ۱۹۲۸ء میں افسانوی مجموعہ ,,خاکِ پروانہ،، شائع ہوا۔

(۱۸) ۱۹۲۸ء میں افسانوی مجموعہ ,,خواب وخیال،، شائع ہوا۔

(۱۹) ۱۹۲۸ء میں پریم چند کا ناول ,,چوگانِ ہستی،، شائع ہوا؛ جس کا ہندی نام ,,رنگ بھومی،، ہے۔

(۲۰) ۱۹۲۸ء میں پریم چند کا ناول ,,غبن،، شائع ہوا۔

(۲۱) ۱۹۲۸ء میں پریم چند نے سوانحی مضامین پر مشتمل کتاب ,,باکمالوں کے درشن،، شائع کی؛ جس میں تیرہ نام ور شخصیات پر خاکے لکھے گئے؛ ان میں رانا پرتاب، راجا ٹوڈرمل، راجا مان سنگھ، بہاری، کیشو، رنجیت سنگھ، رانا جنگ بہادر، رہنا ہڈسن، ٹامس گینس بر، سوامی وویکا نند، گیری بالڈی، رام کشن بھنڈار کراور گوپال کرشن گوکھلے شامل ہیں۔

(۲۲) ۱۹۲۹ء میں پریم چند نے افسانوی مجموعہ ,,فردوسِ خیال،، شائع کرایا۔

(۲۳) ۱۹۲۹ء میں پریم چند نے رام چرچا کے عنوان سے بچوں کے لیے ایک کتاب شائع کی۔

(۲۴) ۱۹۳۰ء میں پریم چند نے افسانوی مجموعہ ,,پریم چالیسی،، کا پہلا اور دوسرا حصہ شائع کرایا۔

(۲۵) ۱۹۳۱ء میں پریم چند کا ناول ,,میدانِ عمل،، شائع ہوا؛ جس کا ہندی نام ,,کرم بھومی،، ہے۔

(۲۶) ۱۹۳۲ء میں پریم چند نے سوانحی مضامین پر مشتمل کتاب ,,باکمالوں کے درشن،، کا دوسرا ایڈیشن شائع کرایا؛ جس میں گیارہ نام ور شخصیات پر خاکے لکھے گئے؛ ان میں رانا پرتاب، ٹوڈرمل، مان سنگھ، اکبر، بدرالدین طیب جی، سرسید احمد خان، مولانا وحیدالدین سلیم، مولوی عبدالحلیم شرر، گیری بالڈی، رنجیت سنگھ، اور سوامی وویکا نند شامل ہیں۔

(۲۷) ۱۹۳۴ء میں پریم چند کا افسانوی مجموعہ ,,آخری تحفہ،، شائع ہوا۔

(۲۸) ۱۹۳۶ء میں پریم چند نے افسانوی مجموعہ ,,زادِراہ،، شائع کرایا۔

(۲۹) ۱۹۳۶ء میں پریم چند کا ناول ,,گئو دان،، شائع ہوا۔

(۳۰) ۱۹۳۷ء میں پریم چند نے افسانوی مجموعہ ,,دودھ کی قیمت،، شائع کرایا۔

(۳۱) ۱۹۳۸ء میں پریم چند نے افسانوی مجموعہ ,,واردات،، شائع کرایا۔

(۳۲) پریم چند کا آخری ناول ,,منگل سوتر،، ہے؛ جو ان کا دیہانت ہونے کی وجہ سے نامکمل رہا۔

مذکورہ بالا افسانوں اور ناولوں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ پریم چند کا پہلا اور آخری ناول نامکمل ہے؛ علاوہ ازیں پریم چند نے کہانیاں اور ڈرامے بھی لکھے ہیں؛ ان کی سوانح کے مطالعے سے اس بات کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ انھوں نے دو ڈرامے ,,کربلا،، اور ,,روحانی شادی،، کے نام سے لکھے ہیں۔

الغرض پریم چند ایک بحرِ بیکراں تھے؛ وہ اپنی تحریروں میں علم و ادب اور سماج کے کسی بھی مسئلہ پر حاضر دماغی سے تحریر قلم بند کرتے تھے؛ ان کا اسلوب تحریر نہایت دل کش اور حشو وزوائد سے پاک منتزاد دلیل سے محکم ہوتا تھا۔ زبان بہت شستہ اور علمی ہوتی تھی یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر تحریر ادب و بلاغت کا ایک دل آویز نمونہ ہوتی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد انورالدین
صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج برائے نسواں
گولکنڈہ حیدرآباد 008 500 (تلنگانہ)
موبائل: 9032458868

مضامین

منشی نول کشور کی صحافتی وادبی خدمات

جن غیر مسلم شخصیات نے اردو زبان وادب کی ناقابل فراموش خدمات انجام دیں ان میں سے ایک نام منشی نول کشور کا بھی ہے۔ ان کی بیش بہا خدمات میں لکھنو میں نول کشور پریس کا قیام ہے۔ ان کا شمار مشرقی علوم وفنون کے بڑے محسنین میں ہوتا ہے۔ طباعت' کتابت اشاعت اور صحافت میں ان کی نمایاں خدمات سے انکار ممکن نہیں۔ انھوں نے جس قدر محنت مشقت اور لگن کے ساتھ اردو زبان' ادب' تہذیب' ثقافت کی خدمت انجام دیں اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔

منشی نول کشور کی پیدائش 1836 کو ریہٹر نام کے ایک گاؤں میں ہوئی جو متھرا ضلع (یوپی) کا حصہ ہے۔ ان کے والد کا نام بابو جمنا پرشاد بھارگو تھا' جو علی گڈھ کے خوشحال زمین دار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ نول کشور کے دادا منشی بال مکند انگریزوں کے عہد میں آگرہ کے مہتمم محافظ خانہ تھے۔ نول شکور کی ابتدائی تعلیم وتربیت ان کے آبائی گاؤں میں ریہٹر کے قریب واقع مقام ساسنی میں ہوئی۔ مکت میں انھوں نے فارسی کی درسی کتابیں پڑھیں۔ عربی زبان بھی سیکھی۔ یہ وہ دور تھا جب فارسی کی جگہ اردو لے رہی تھی۔ منشی جی نے دس برس کی عمر میں ابتدائی تعلیم مکمل کرلی۔ ثانوی تعلیم کے حصول کی خاطر انھوں نے آگرہ کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں پانچ سال تک تحصیل علم میں مصروف رہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے مضمون نگاری کا آغاز کیا۔ مختصری مدت میں ہی ان کے مضامین شمالی ہند کے مشہور اخبار ''سفیر آگرہ'' میں شائع ہونے لگے۔ ان کے مضامین کی پسندیدگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حکومت ہند نے ان کے مضامین سے متاثر ہوکر ان کا وظیفہ مقرر کردیا۔ ان کی دل چسپی صحافت میں بڑھنے لگی۔ جب ان کی شہرت ایک مضمون نگار کے طور پر بڑھنے لگی تو اخبار ''کوہ نور'' لاہور کے ایڈیٹر منشی ہرسکھ رائے نے نول کشور کو اپنے اخبار میں کام کرنے کے لیے ان سے ربط پیدا کیا۔ نول کشور منشی ہرسکھ رائے کی دعوت پر لاہور چلے گئے اور ''کوہ نور'' اخبار کے انتظامی عملے میں شامل ہوگئے۔ وہاں انھوں نے انتظامی ذمہ داریوں کو نہایت خوش اسلوبی سے سنبھالا۔ نول کشور نے چار سال تک لاہور میں اپنی ذمہ داریاں نبھائیں۔ اس وقت ان کی عمر محض اکیس سال تھی 1857 کی تحریک آزادی کا آغاز ہوگیا۔ ملک کے حالات بگڑنے لگے۔ وہ ان حالات کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیتے رہے۔ ملک وقوم کی خدمت کا جذبہ ان کے دل میں موجزن تھا۔ انھوں نے اسی وقت یہ طے کیا کہ وہ اپنا اخبار جاری کریں گے۔ چنانچہ وہ کوہ نور اخبار سے الگ ہوگئے۔ جب غدر کا ہنگامہ کمزور پڑا تو وہ لاہور سے آگرہ منتقل ہوگئے۔ لیکن ان کے منصوبے کی تکمیل کے لیے آگرہ کا ماحول سازگار محسوس نہیں ہوا تو وہ لکھنو چلے گئے جو علم وفضل کا گہوارہ تھا۔

منشی نول کشور 1858 کے ابتدائی دنوں میں لکھنو پہنچے۔ وہاں انھوں نے آغا میر خاں کی ڈیوڑھی میں ایک مکان کرایہ پر حاصل کیا جو چھوٹا ضرور تھا لیکن ان کے مقصد کی تکمیل کے لیے کافی تھا۔ جب انھیں یہ مکان ناکافی محسوس ہونے لگا تو کچھ دنوں کے بعد لکھنو کے ہی محلّہ رکاب گنج میں راجہ مان سنگھ کی کوٹھی میں ایک موزوں جگہ مل گئی اور وہاں طباعت کا کام کرنے لگے۔ چوں کہ اس وقت ان کے پاس سرمائے کی کمی تھی' اس لیے انھوں نے چند ہینڈ پریس خریدے اور انہی دستی پریسوں کے ذریعہ اپنے کام کا آغاز کیا۔ یہ وہ دور تھا جب لیتھو پریس بھی دستیاب نہ تھا۔ لاہور کے زمانۂ قیام میں انھوں نے جو تجربے حاصل کیے تھے' اس کا بھرپور استعمال کرنا شروع کیا۔ ابتداء میں چھوٹی چھوٹی مذہبی کتابیں اور بچوں کے لیے درسی کتابیں وغیرہ چھاپنے لگے۔ دلچسپ بات یہ کہ وہ جو کچھ بھی چھاپتے تھے' وہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوجایا کرتے تھے۔ پریس کے ساتھ ساتھ 26 نومبر 1858 کو انھوں نے تاریخ ساز اخبار 'اودھ اخبار' کی اشاعت کا آغاز کیا۔ اس طرح ''اودھ اخبار'' کا پہلا شمارہ جب منظر عام پر آیا تو اس کے مواد اور معیار سے لوگ بہت متاثر ہوئے۔ یہ اخبار محض چار صفحات پر مشتمل تھا۔ علاقہ کی مناسبت سے ''اودھ اخبار'' کو اس کے نام کی وجہ سے بھی بہت پسند کیا گیا۔ رفتہ رفتہ اس اخبار کے نامہ نگار مختلف صوبوں میں مقرر ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے تمام بڑے شہروں میں ''اودھ'' اخبار کے نامہ نگار اور سفیر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں یہ جملہ مشہور تھا کہ ''صوبوں اور ریاستوں کی راجدھانی میں حکومت کے نمائندے رہتے ہیں یا نول کشور کے''۔ ناظر کاکوروی نے اپنی کتاب ''اردو ہندی کے ادیب'' مطبوعہ انوار بک ڈپو لکھنو میں اس بات کا ذکر کیا ہے۔

''اودھ اخبار میں اس عہد کے بڑے بڑے ادیب اور قدر آور شخصیات نے ادارتی اور صحافتی ذمہ داریاں سنبھالی تھیں۔ ان میں پنڈت رتن ناتھ سرشار' مولانا عبدالحمید کاکوروی' عبدالحلیم شرر' سید جالب دہلوی' منشی نادر حسین نادر کاکوروی' نوبت رائے نظر' مرزا محمد عسکری' منشی پریم چند' امید امیٹھوی' مولانا عبدالباری آسی لکھنوی' امین سلونوی' شوکت تھانوی وغیرہ شامل تھے۔ منشی نول کشور کے پوتے کے پوتے کو بھارگو نے اپنے ایک انٹرویو مطبوعہ انقلاب' بمبئی میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ منشی جی کا چھاپہ خانہ ان معنوں میں بے حد مشہور تھا کہ اس میں کلام پاک کی کتابت کرنے والے خوش نویسوں اور خطاطوں کو سخت ہدایت تھی کہ کبھی بھی بلا وضو کتابت نہیں کریں گے۔ اسلامی تصنیفات کے سلسلے میں پاکیزگی اور طہارت کا پورا خیال رکھا۔

مطبع نول کشور میں دینی اور مذہبی کتابوں کی اشاعت میں جس پاکیزگی کا خیال رکھا جاتا تھا' اس کی مثال طباعت کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ نول کشور نے اپنے مطبع کے ایک حصہ میں خوشنویسی سکھانے کے لیے ''دارالکتابت'' بھی قائم کر رکھا تھا۔ امیر حسن نورانی لکھتے ہیں:

محسن علم و فن نول کشور نے اپنے مطبع میں ایک ''دارالکتابت'' قائم کیا۔ اس کے لیے شاہی دور کے کہنہ مشق اساتذہ کی خدمات حاصل کیں۔ جنھوں نے اس فن کا ذوق و شوق رکھنے والوں کی تربیت کی اور اس کی ترقی کے لیے محنت اور لگن سے کام کیا۔ اس دارالکتاب کی بدولت کاتبوں کی تعداد میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا رہا۔ مطبع نول کشور میں کام کرنے والے کاتبوں کی تعداد سو سے زیادہ تھی' جیسا کہ مطبع کے باقی ماندہ بعض رجسٹروں سے معلوم ہوا ہے۔ غیر مستقل لکھنے والوں کی تعداد بھی سو سے کم نہ تھی۔ بعض زمانے میں اس سے زیادہ رہی ہے''۔ (کتاب منشی نول کشور اور ان کے خطاط و خوشنویس' امیر حسن نورانی' ترقی اردو بیورو نئی دہلی 1994 صفحہ 14)

منشی نول کشور کے مطبع میں شعبۂ کتابت کے علاوہ شعبۂ تصنیف و تالیف' شعبۂ ترجمہ' شعبۂ حصول و فرمائشات' شعبۂ فروخت کتب' شعبۂ ترسیل' شعبۂ اکاؤنٹنسی' شعبۂ نشر و اشاعت (مع پبلسٹی) وغیرہ شعبہ جات تھے۔ انھوں نے مطبع نول کشور کے استحکام اور وسعت کے لیے مختلف شہروں میں شاخیں بھی قائم کی تھیں۔ ان کے پریس کی مطبوعہ کتابوں کی فروخت کے لیے کانپور' لاہور' پٹیالہ' اجمیر' دہلی' کلکتہ' پٹنہ' الہ آباد وغیرہ میں ایجنسیاں تھیں۔ ان ایجنسیوں نے نول کشور پریس سے شائع شدہ کتابیں پورے ملک میں پہنچانے کا کام کیا۔ اُس پریس کی ایک ایجنسی لندن میں بھی قائم تھی' جہاں ضرورت کی کتابیں بھیجی جاتی تھیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے پریس سے شائع شدہ کتابوں کی ترویج و اشاعت کے لیے کتنا موثر نظام قائم کر رکھا تھا۔ انھوں نے کثیر تعداد میں عربی فارسی اور اردو میں ہزاروں کتابیں شائع کیں۔ ایک اندازے کے مطابق منشی نول کشور کے انتقال کے وقت تک کم و بیش 37 برس کی مدت میں متعدد موضوعات پر اردو عربی اور فارسی میں چار ہزار سے زائد کتابیں چھپ کر منظر عام پر آئیں۔ ان تمام کتابوں کا یہاں ذکر ممکن نہیں تاہم چند اہم کتابوں کے نام کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ قارئین کو اندازہ ہو سکے کہ مطبع نول کشور نے کتنی اہم اور ضخیم ترین کتابیں شائع کیں:

قرآن مجید' قرآن مجید کے مختلف تراجم اور تفاسیر' فتاوئی عالمگیری کا اردو ترجمہ بنام فتاوئی ہندیہ' ہدایہ کا اردو ترجمہ ''عین الہدایہ''، مکمل اردو ترجمہ' تفسیر مواہب الرحمٰن' تاریخی کتابوں میں تاریخ فرشتہ (دو جلدیں) آثار الصنادید (تین جلدیں)' اکبر نامہ (دو جلدیں) آئین اکبری (تین جلدیں) طبقات اکبری (سات جلدیں) حدیقۃ الاقالیم' تزک جہانگیری' مفتاح التواریخ' شاہ نامہ فردوسی' قصص الانبیاء' فتح الشام والمصر (دو جلدیں) جامع التواریخ' سیر المتاخرین (دو جلدیں) عجائب القصص' خزینۃ الاصفیاء (دو جلدیں) (روضۃ الصفا) سات جلدیں) دبستان مذاہب' تاریخ اردو وغیرہ۔ طب کی کتابوں میں خصول بقراطی' خلاصۃ التجارب' مجربات اکبری' کفایہ منصوری' ضیاء الابرار' مجربات رضائی' دستور العلاج' میزان طب' طب اکبر' مفرح القلوب' اُم العلاج' طب یوسفی' قرابادین قادری' علاج الامراض' مخزن ادویہ' مفردات ناصری' مجربات بوعلی سینا وغیرہ۔ ان کتابوں کے علاوہ وقائق الاخیار (امام غزالی) کا اردو ترجمہ' صبح کا ستارہ'' تاریخ ادب اردو (رام بابو سکسینہ) عود ہندی' دیوان غالب' اردوئے معلّیٰ (مزار غالب) اعجاز رقم قطعات الجواہر' اثر رنگ چیں (خطاطی پر مشتمل کتابیں) لغات کشوری کے علاوہ اردو داستانوں میں طلسم ہوش ربا اور داستان امیر حمزہ (اول تا ششم) چھ جلدیں' شامل ہیں۔ علاوہ ازیں فقہ اور مستند اسلامی کتابوں کے اردو تراجم' فرہنگ و لغات (عربی فارسی اردو) تصوف و اخلاق' تاریخ و سیرت اور اوراد و وظائف' عملیات' علم نحو و صرف' سنسکرت کتابوں کے اردو تراجم' اردو کی نثری داستانیں' بوستان خیال (داستان) فسانہ آزاد' طبی لغت' فارسی کلیات و دواوین' قصائد و مثنویات' اردو اور فارسی شعرا کے تذکرے' عروض و قوافی' فارسی نثر کی

کتابیں مثلاً گلستانِ سعدی وغیرہ‘ بوستانِ سعدی‘ ادب و انشاء‘ نجوم‘ جفر‘ رمل‘ متفرق علوم و معلومات عامہ‘ سیر و سوانح‘ مثنویات‘ افسانے‘ ناول‘ کہانیاں‘ (اردو) ابتدائی درسی کتب‘ کتب قوانین (اردو)‘ علم موسیقی‘ فارسی اردو کتابوں کے ہندی تراجم‘ فارسی اردو کتب کے انگریزی ترجمے جیسے موضوعات پر مشتمل ہزاروں کتابیں مطبع نول کشور سے شائع ہو کر پوری ادبی دنیا میں پہنچ گئیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ منشی نول کشور کا ویژن کتنا وسیع تھا اور ان کی فکر کتنی گہری تھی۔

منشی نول کشور نے پریس سے ہونے والی آمدنی کو ملک و قوم کی خدمت میں صرف کیا۔ آگرہ کالج‘ محمڈن کالج علی گڑھ‘ جبلی کالج لکھنو اور دیگر اداروں کی دل کھول کر مدد کی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے قدر دانوں میں راجہ‘ مہاراجہ‘ رؤسا اور شعرا و ادبا بھی شامل ہو گئے۔ سر سید احمد خاں‘ مرزا غالب‘ راجہ محمود آباد‘ مہاراجہ پٹیالہ‘ راجہ جے پور کے علاوہ انگریز حکام و عہدیداران بھی ان کے علم و فن اور ان کی علمی خدمات کے معترف تھے۔ مرزا غالب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ”خدا نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت دی ہے‘ گویا بجائے خود قرن السعدین ہیں“ (اردوئے معلی)۔

رام بابو سکینہ نے اپنی کتاب ’تاریخ ادب اردو‘ میں مطبع نول کشور کی ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

”اس مطبع نے زبان اردو کی بڑی خدمت کی اور اس کی ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالا اور نادر و قدیم کتابوں کی اشاعت مشہور کتب فارسی و عربی کے تراجم جدید کتابوں کی پبلک مذاق کے موافق تیار کی۔ اور نیز اسکولی کتابوں کی تیاری سے ادب اردو پر بڑا احسان کیا۔“ (تاریخ ادب اردو‘ رام بابو سکینہ‘ ادارہ کتاب الشفاء‘ کوچہ چیلان‘ نئی دہلی 2000‘ صفحہ 346)۔

منشی نول کشور کا اہم ترین کارنامہ ”داستان امیر حمزہ“ جیسی ضخیم کتاب کی اشاعت ہے‘ جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ یہ کتاب عہد اکبری میں ابوالفضل فیضی نے اکبر کی تفریح طبع کے لئے تیار کی تھی۔ تبسم کاشمیری نے لکھا ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ 46 ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے حوالے سے رام بابو سکسینہ نے جو معلومات فراہم کی ہیں وہ یہ ہیں:

”داستان امیر حمزہ ایک حجیم اور ضخیم کتاب متعدد جلدوں میں ہے۔ اصل کتاب فارسی میں شیخ ابوالفضل فیضی نے اکبر کی تفریح طبع کے واسطے تیار کی تھی۔ اس کے آٹھ دفتر ہیں اور ہر دفتر میں صدہا صفحات کی کئی کئی جلدیں ہیں جن کی مجموعی تعداد سترہ اور تعداد صفحات سترہ‘ اٹھارہ ہزار سے کم نہ ہو گی۔ سب سے مشہور دفتر اول مسمّی بہ نوشیرواں نامہ دو جلدوں اور دفتر پنجم موسوم بہ ”طلسم ہوش ربا“ سات جلدوں میں ہے اور مؤخر الذکر بہت مقبول عام ہے۔ طلسم ہوشربا کی اول چار جلدوں کا ترجمہ محمد حسین جاہ اور آخر تین جلدوں کا ترجمہ احمد حسین قمر کا ہے۔ ایک منظوم ترجمہ طوطا رام شایاں نے بھی کیا تھا“۔ نوشیروان نامہ کا ترجمہ منشی نول کشور صاحب کی فرمائش سے شیخ تصدق حسین داستان گو نے کیا تھا۔ اس کتاب میں ایک فرضی طویل افسانہ امیر حمزہ کا ہے‘ جو پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کے عم بزرگوار تھے‘ جس میں ایک قصہ سے سیکڑوں قصے پیدا ہوتے چلے گئے ہیں“۔ (تاریخ ادب اردو صفحہ 347)۔

افسوس کہ 1895 میں منشی نول کشور کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد منشی پراگ نارائن کی نگرانی میں مطبع نول کشور اسی نام سے طباعت کا کام کرتا رہا۔ ان کی محنت اور لگن سے ”اودھ اخبار“ بھی اسی آب و تاب کے ساتھ جاری رہا۔ منشی پراگ نارائن کی موت کے بعد مفتی کشن نارائن نے پریس کی ذمہ داریاں سنبھالیں‘ لیکن منشی نول کشور اور منشی پراگ نارائن والی بات نہ رہی۔ چنانچہ 1944 تک اودھ اخبار 92 برس جاری رہ کر بند ہو گیا۔ منشی کشن نارائن کے انتقال کے بعد ان کے بیٹوں راجہ رام کمار بھارگو اور تیج کمار بھارگو نے پریس سنبھالا‘ لیکن دونوں بھائیوں میں زیادہ عرصہ تک نباہ نہ رہ سکا اور پریس و نیز دیگر املاک دو حصوں میں تقسیم ہو گئیں جس سے تیسری پشت تک پہنچ کر پریس پر زوال آ گیا۔ پوری دنیا میں مشہور نول کشور کے نام سے اس چھاپہ خانہ کا نام بھی تبدیل ہو گیا۔ اب یہ پریس ”راجہ رام کمار پریس“ اور ”تیج کمار پریس“ کے نام سے چل رہا ہے بلکہ آخری سانس لے رہا ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر صابر علی سیوانی

مکان نمبر 9-4-87/C/12‘ فرسٹ فلور‘ عقب مغل ریذیڈنسی‘ ٹولی چوکی‘ حیدرآباد (تلنگانہ) سیل نمبر: 9989796088

مضامین

پنڈت دامودر ٹھاکر ذکی کی نعتیہ شاعری

نعت' کے لفظی معنی کسی کے وصف کو نمایاں کرنے کے ہیں لیکن اصطلاحاً اس لفظ کو آنحضرت ﷺ کی مدحت میں استعمال کیا جاتا ہے۔ آنحضرتؐ کی تعریف وہ توصیف میں صحابہ کرام نے آپؐ کے ظاہری و باطنی محاسن کا بخوبی اظہار کیا ہے جس سے صحابہ کرام کا آنحضرتؐ سے قلبی تعلق اور آپؐ کی حقیقی عظمت واضح ہوتی ہے۔ ممتاز حسین اپنی کتاب ''خیر البشر کے حضور'' میں لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک ہر وہ شعر نعت ہے جس کا تاثر ہمیں حضورؐ کی ذات گرامی سے قریب لائے جس میں حضورؐ کی مدح ہو یا حضورؐ سے خطاب کیا جائے''۔ ('خیر البشر کے حضور میں' از ممتاز حسین ص 15)

نعت گوئی نہ صرف عربی، فارسی اور اردو میں فروغ پائی بلکہ دنیا کی تمام زبانوں میں وجود میں آئی۔ عجمی زبانوں میں نعت گوئی کا رواج اس وقت عام ہوا جب مسلمانوں کو فتوحات حاصل ہوئیں اور وہ عالم عرب سے نکل کر یوروپ و دیگر ممالک میں بسنے لگے۔ جس کی وجہ سے عجمی زبانوں میں بھی نعت گوئی کی روایت عام ہوئی۔ چنانچہ سراج احمد قادری نعت گوئی کا تاریخی منظر نامہ پیش کرتے ہوے رقم طراز ہیں:

''جب اسلام حدود عرب سے نکل کر عجم میں داخل ہوا تو جہاں جہاں گیا وہاں وہاں اس نے گہرے علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی اثرات چھوڑے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی علوم و ادب اور تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ نعت گوئی کی روایت کا رواج بھی عام ہوا اور جو لوگ بنیادی طور سے اسلام میں داخل ہوے تھے انکے قلب و جگر میں اسلام اور بانی اسلام حضرت محمد رسول کی سچی محبت واضح الاعتقادی کے ساتھ سرایت کر گئی جس کے باعث ان کی موزونی طبع اور واردات قلبیہ متقاضی ہوئی کہ وہ ہادیٔ عالم حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور اپنی عقیدتوں اور محبتوں کا تحفہ اسان طریقے سے پیش کریں'' (نعتیہ روایت کا عروج وارتقاء' از ڈاکٹر سراج احمد قادری)۔

آنحضرت ﷺ کی مدح و توصیف میں عقیدت و محبت کا اظہار نہ صرف مسلم شعراء نے کیا ہے بلکہ غیر مسلم شعراء حضرات نے بھی آقائے نامدارؐ پر عقیدت و الفت کے پھول نچھاور کیے ہیں۔ ہندوستان کے نامور شعراء جگن ناتھ آزادؔ، مہیندر سنگھ بیدی سحرؔ، مالک رام سالکؔ، امرچند، پھچھی نارائن سری واستو آسناؔ، مہاراجہ کلیان سنگھ عاشقؔ، منشی گوبند پرشاد فضاؔ، برج نارائن چکبستؔ اور سرکشن پرشاد شادؔ نے بھی عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر نعتیں کہی ہیں۔

بقول خورشید احمد: ''رسولِ کریم حضرت مصطفیٰؐ کے حسن اخلاق، انسان دوستی، رحم دلی، سخاوت، انصاف اور انسانیت پر مبنی تعلیم اور آپکا اسوۂ حسنٰی ایسے اوصاف ہیں جن کی مثال تاریخِ عالم پیش نہیں کر سکتی۔ حضورؐ نے اپنے اخلاق و زندگی کے عملی نمونے سے مسلم و غیر مسلم سب ہی کو یکساں طور پر متاثر کیا ہے۔ (ماہنامہ شاداب حیدرباد۔ جولائی 2007ء اردو کے غیر مسلم شعراء کی نعت گوئی۔ از خورشید احمد ص 9-10)

ان شعراء نے نعتیہ اشعار رسماً ہی تحریر نہیں کیے بلکہ ان کے کلام میں جذبات کی فراوانی اور فطری لگاؤ پایا جاتا ہے۔ پرشورام پرشادؔ کی ایک نعت کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

ہمارے آقاؐ، ہمارے مالک، شفیعِ محشر، رسولِ اکرمؐ!
پتا ملا حق کا تم سے ہم کو ہمارے رہبر رسولِ اکرمؐ!
کبھی تو پرشادؔ شاد ہوگا، کبھی تو جلوہ دکھاؤ گے تم
پڑا رہونگا میں دل کو تھامے تمھارے در پر رسولِ اکرمؐ!

(حضور والا شان مرتب خورشید جنیدی 1983ء ص 25)

اسی طرح سے عشق رسولؐ میں ڈوبے مذکورہ شعراء آنحضرتؐ پر مدحت کے گلہائے عقیدت نچھاور کرتے رہے۔ سرزمین کو ڈنگل علم و

ادب کا گہوارہ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں نہ صرف تہذیبی وادبی ذوق کو فروغ حاصل ہوا بلکہ اُردو شعراء وادبا کی عملی قدردانی کی گئی انہیں میں سے دامودر ذکی ہیں۔ان کی پیدائش 20 نومبر 1902ء کو ایک برہمن خاندان میں ہوئی۔ان کے والد کا نام شیورام پنت تھا۔ ذکی 5 برس کے تھے کہ وہ سایۂ پدری سے محروم ہوگئے۔ چچانے ان کی تربیت کی اور والدہ بھی محنت ومزدوری کر کے گھر کے اخراجات چلاتی تھیں۔ذکی نے کم عمری سے ہی شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ بارہ سال ہی کے تھے کہ وہ اشعار لکھنے اور اساتذہ اور ساتھیوں کو سنانے لگے۔ان کے اساتذہ میں جناب محمد اسمٰعیل ازلؔ صاحب جن کی رہبری نے ذکی کے شعری ذوق کو جلا بخشی۔ان کے بعد مایہ ناز شاعر حبیب اللہ وفاؔ ہیں جن سے وہ اصلاح سخن لیتے رہے۔ یہاں تک کہ اپنی شاعری کو کمال کے درجہ تک پہنچایا۔ چنانچہ ذکی کے سینکڑوں تلامذہ' آسمانِ ادب کے درخشاں ستارے بنے:

ایک دن نقشِ قدم پر مرے بن جائے گی راہ — آج صحرا میں تو تنہا ہوں کہیں کوئی نہیں

عشق کی راہوں میں آیا ہے اک ایسا بھی مقام — صرف اک میں ہوں وہاں اہلِ زمیں کوئی نہیں

دامودر ذکی کی شاعری دلی جذبات وکیفیات کی ترجمانی کرتی ہے۔کلام میں سادگی ہے۔جس کی وجہ سے ہر عام آدمی بھی ان کے کلام کو با آسانی سمجھ سکتا ہے۔ذکی کے نعتیہ اشعار ان کے خلوص دل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ذکی کا کلام ساقی،سب رس' شہاب اور ہمایوں وغیرہ رسائل میں شائع ہوتا تھا۔ذکی مسلمانوں کی ہر محفل میں مدعو کئے جاتے تھے۔وہ اکثر مشاعروں کی صدارت کرتے۔وہ میلادالنبیؐ کے موقع پر نعتِ نبیؐ اتنا ڈوب کر سناتے کہ سامعین پر وجدانی کیفیت طاری ہوجاتی۔کوڑنگل کے جشن میلادالنبیؐ میں ذکی نے نعت شریف مسدس کی شکل میں سنائی جس کا ایک بند اس طرح سے ہے:

میں ذرۂ حقیر وہ خورشیدِ ضوفشاں — میں قطرۂ صغیر وہ دریائے بے کراں

میں بے نوا ' فقیر ہوں سرکارِ دو جہاں — نعت محمدی کہاں' میری زباں کہاں

یارب مدد کہ طاقت مدحِ رسولؐ دے — درمانِ آرزو میں مرادوں کے پھول دے

ذکی کی نعت شریف کا ایک اور بند اس طرح سے ہے:

چشم مبارک آپؐ کا جس میں سمائے رب — دہن مبارک آپؐ کا جس میں نوائے رب

ظاہر میں آپؐ سرورِ عالم بنے ہوئے — باطن میں نورِ عرشِ معظم بنے ہوئے

ذکی کا پہلا مجموعہ کلام سفینہ ذکی 1966ء میں سابق وزیر داخلہ حکومت آندھراپردیش نواب میر احمد علی خاں کے ہاتھوں افق ادب پر چمکا اور دوسرا مجموعہ کلام ''اوج'' 1971ء میں شائع ہو کر مقبول عام ہوا۔ انہوں نے نعت گوئی انتہائی متاثر کن انداز میں کہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کی نعتیہ شاعری کے بارے میں کہا ہے کہ:

''ایسے سرمست مداحِ نبیؐ کو غیر مسلم کس زبان سے کہوں۔غزلیہ شاعری بھی کچھ کم درجہ کی نہیں۔ دکن کے ایک دیہات کے باشندے نے خدا جانے ایسی زبان کہاں سے سیکھ لی''۔(سفینۂ ذکی۔ پنڈت دامودر ذکی کے مجموعہ کلام کا انتخاب۔ص 15)

مسدس کی ہیئت میں ذکی کی نعت کے چند منتخب اشعار درج ذیل ہیں:

گھر کر گئی ہے دل میں عقیدت رسولؐ کی — آباد ہو رہی ہے محبت رسولؐ کی

آنکھوں میں نور بیز ہے عزت رسولؐ کی — بے ساختہ زُباں پہ ہے مدحت رسولؐ کی

☆☆☆

ڈاکٹر عائشہ بیگم' صدر شعبہء اُردو
گورنمنٹ ڈگری کالج، ظہیر آباد۔ تلنگانہ
موبائل: 9849896815

پنڈت مدن موہن دتاتریہ کیفی کا شعری اختصاص

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی 13 / دسمبر 1866ء کو دہلی میں کشمیری پنڈتوں کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام پنڈت کنہیا لال دتاتریہ تھا جو راجا بھر پور سنگھ کے عہد میں شہر نابھ میں محکمۂ پولیس کے اعلیٰ افسر (کوتوال) تھے۔ کیفی ابھی کم سن ہی تھے کہ ان کے والد کا عین جوانی میں ہیضہ کے مرض میں انتقال ہوگیا اس کے کچھ دنوں بعد والدہ بھی داغِ مفارقت دے گئیں۔ کیفی کی پرورش و نگہداشت ان کے عزیزوں نے کی۔

چوں کہ کیفی پنڈتوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا انھوں نے اپنے علم و فضل سے کشمیری پنڈتوں کا نام خوب روشن کیا اور تقریباً پون صدی تک اردو شعر و ادب کی خدمات انجام دیں۔ کشمیری پنڈتوں کی اردو سے بے لوث محبت، دلچسپی اور اردو خدمات کا سلسلہ تقریباً تین صدیوں پر محیط ہے۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی چندر بھان برہمن سے لے کر پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی تک پہنچتا ہے۔ دیا شنکر نسیم، پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ، برج نارائن چکبستؔ اور آنند نرائن ملاؔ جنھیں اردو ادب کی دنیا میں باکمال شہرت حاصل ہوئی، انھیں کشمیری پنڈتوں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

کیفی کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ اردو اور فارسی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہائی اسکول میں داخلہ لیا اور وہاں انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کی۔ کیفی سینٹ اسٹیفن کالج، دہلی کے سند یافتہ تھے۔ انھوں نے 1880ء میں اسی کالج سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ اردو اور فارسی زبان کے ساتھ ساتھ آپ کو انگریزی زبان میں بھی کافی عبور حاصل تھا۔ علاوہ ازیں ہندی، عربی اور سنسکرت زبانوں سے بھی وہ واقف تھے۔

کیفی کی شادی لکھنو کے ایک پنڈت خاندان میں ہوئی۔ ان کے خسر پنڈت اجودھیا ناتھ شوپوری لکھنو میں زمانہ قدیم سے رہائش پذیر تھے۔ کیفی کی بیوی بھی ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ جس وقت کیفی کی عمر 58 سال تھی ان کی بیوی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ بیوی کی بے وقت اور اچانک موت کا صدمہ کیفی کو عمر بھر رہا کیوں کہ جس وقت ان کی بیوی کا انتقال ہوا۔ اس وقت ان کی زندگی نہایت سکون میں گزر رہی تھی، ان کے دونوں بیٹوں کو اچھی نوکریاں مل گئی تھیں۔ ان کے خود کفیل ہونے کی وجہ سے کیفی کی مالی پریشانیاں کم ہوگئی تھیں مگر ایسے میں بیوی کی جدائی کیفی پر بہت شاق گزری۔ بہ قول مرزا خلیل احمد بیگ ''جب تک زندہ رہیں مصیبتیں ہی اٹھاتی رہیں اور اب آرام سے گزرتی تو موت نے فرصت نہ دی''۔

کیفی کے تین بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام پنڈت پیارے موہن دتاتریہ، دوسرے بیٹے کا نام پنڈت سریندر موہن دتاتریہ اور تیسرے بیٹے کا نام پنڈت مدن موہن دتاتریہ تھا۔

پنڈت برج مدن موہن دتاتریہ کیفی اردو کے سچے عاشق اور پرستار تھے۔ اردو سے بے پناہ محبت کرتے تھے خود کو اردو کا خادم تصور کرتے تھے لیکن یہ بجا ہے کہ کیفی اردو کے محسن بھی تھے اور خادم بھی۔ انھوں نے نہ صرف علمی سطح پر اردو کی گراں قدر خدمات کو انجام دیا بلکہ عملی طور پر بھی اردو کی ترقی اور بقا کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ وہ جہاں بھی جاتے علم و ادب کی آبیاری میں مصروف رہتے اور اردو کے فروغ کے لیے نئے نئے منصوبے تیار کرتے رہتے۔

کیفی بہت بڑے عالم تھے لیکن دکھاوا یا نام و نمود کی خواہش ان کے پاس بالکل نہیں تھی۔ کیفی رجائیت پسند تھے۔ زندگی میں ناامیدی کی کیفیت میں بھی وہ مایوسی سے اجتناب برتتے تھے۔ کیفی کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ بہ قول مالک رام ''انھیں پڑھنے لکھنے کا

گویا جنون تھا''۔انھوں نے علم کے حصول کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنالیا تھا۔انہیں اردو اور فارسی کی کلاسیکی شاعری پر کافی عبور حاصل تھا۔کلاسیکی شعرا کے سینکڑوں اشعار انھیں منھ زبانی یاد تھے۔اپنے لکچر اور تقاریر کے دوران وہ اکثر و بیشتر اشعار جا بہ جا پیش کرتے تھے۔اس سے ان کے حافظے پر ان کی قدرت اور وسیع مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔علمی و ادبی معلومات کا بے پناہ ذخیرہ ان کے یہاں موجود تھا۔لسانی موضوعات پر بھی ان کی گرفت مضبوط تھی۔بہ قول خلیل احمد بیگ ''اسی لیے لوگ انھیں اکثر ''انسائکلو پیڈیا'' کہہ دیا کرتے تھے''۔

کیفی کو اردو زبان سے بے پناہ محبت اور گہرا لگاؤ تھا۔اردو سے ان کی محبت دیوانگی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔انھوں نے اردو کے بارے میں ''ہماری زبان'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی جو ہفتہ وار ''ہماری زبان'' میں یکم جولائی 1939ء کو شائع ہوئی۔نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

اُردو ہے جس کا نام ہماری زبان ہے — دنیا کی ہر زبان سے پیاری زبان ہے
وہ وصف کون سا ہے جو اس میں ملا نہیں — سائنس اس میں یا ادب و فلسفہ نہیں
فرقوں کے ربط ضبط کا ہے اس سے انتظام — قومی یگانگی کا ہے قائم اسی سے نام
قوموں کے اتحاد کا یہ شاہکار ہے — کلچر کا اس کی ذات پر دارومدار ہے
تاریخ ہند کی وہ ہے سرتاج آج تک — ہے اتحاد و اُنس کی معراج آج تک

کیفی کی ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔بنیادی طور پر لسانی تحقیق، نئے الفاظ کی اختراع کرنا،وضع اصطلاحات وغیرہ ان کے خاص میدان ہیں۔لیکن اس کے باوصف وہ بہ یک وقت شاعر،انشاء پرداز،ناول نگار،افسانہ نگار،ڈرامہ نگار،تمثیل نگار اور تمثیل پہ بھی کچھ پر عبور رکھتے تھے۔انھوں نے اردو ادب کی دونوں اصناف سخن نظم اور نثر پر طبع آزمائی کی ہے۔انھیں شاعری سے اتنا ہی شغف تھا جتنا کہ نثر سے۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ بنیادی طور پر خود کو ایک شاعر ہی تسلیم کرتے تھے۔انھوں نے شاعری کی کئی ایک اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔غزل تو وہ کہتے ہی تھے اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے مختلف موضوعات پر نظمیں بھی کہی ہیں۔ان کی بعض نظموں کا شمار معرانظموں میں ہوتا ہے۔مثنوی،رباعی اور قطعات پر بھی انھیں کمال حاصل تھا۔نیز مسدس اور ترکیب بند کو بھی انھوں نے اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔

کیفی نے قومی،وطنی،ملی،تاریخی،اخلاقی،اصلاحی اور نیچرل موضوعات پر بے شمار نظمیں لکھیں جن میں فکر کی گہرائی اور احساس پایا جاتا ہے۔کیفی کا شمار فارسی شعرا میں بھی ہوتا ہے'انھوں نے فارسی زبان میں کئی شعر کہے ہیں لیکن جو خوبی ان کی اردو شاعری میں نظر آتی ہے وہ فارسی میں نہیں۔اس بات کا خود انہی کو احساس تھا اس لیے وہ خود کو فارسی کا شاعر نہیں مانتے تھے بہ قول خلیل احمد بیگ ''وہ خود لکھتے ہیں میں فارسی کا شاعر نہیں،دو تین سو شعر کہے ضرور ہیں۔''

کیفی کی ادبی زندگی کا آغاز غزل گوئی سے ہوا۔انھوں نے اوائل عمر ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔کہا جاتا ہے کہ کیفی نے دس برس کی عمر میں پہلا شعر کہا۔کیفی کے یہاں جو شعری ذوق پایا جاتا ہے وہ دراصل ایک بزرگ پنڈت نارائن داس ضمیر دہلوی سے ورثہ میں ملا۔اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ان کے پاس غزلوں کا ایک وافر ذخیرہ جمع ہو گیا جسے کیفی نے اپنے مجموعہ کلام ''واردات'' میں دور اول یعنی ابتدا سے 1884ء تک کے کلام میں شائع کیا۔

کیفی کی شاعری کی ابتدا انیسویں صدی عیسوی کی چوتھی دہائی سے ہوئی۔یہ وہ دور تھا جب انجمن پنجاب لاہور کے زیر اہتمام کرنل ہالرائیڈ کی تائید و سرپرستی میں جدید شاعری کا آغاز ہو چکا تھا۔جس میں حالؔی اور آزادؔ پیش پیش تھے۔ان شعرا نے اس دور میں جو نظمیں کہیں ہیں ان میں ایک طرح کی ندرت پائی جاتی ہے۔و نیز اس کے موضوع کے نئے پن کی وجہ سے ان نظموں سے اردو شاعری کو ایک نیا موڑ ملا۔اس رنگ میں کیفی نے جو پہلی نظم لکھی اس کا عنوان ''دنیا کی بے ثباتی سے سبق'' ہے۔ یہ نظم 1890ء میں لکھی گئی اور ان کے مجموعہ کلام واردات میں شامل

ہے۔نئی شاعری میں تغزل کی اختراع کے باوصف کیفی، حالی اور آزاد کے خیالات سے بہت متاثر تھے۔اسی روش کو اپناتے ہوئے کیفی نے اپنی شاعری کے لیے نئے نئے مضامین تلاش کیے۔جدید اور نادر خیالات کی عکاسی سے شاعری کا دائرہ وسیع کیا اور مسدس و مثنوی کو اختیار کیا جو آزاد اور حالی کے توسط سے جدید شاعری کی مقبول ترین اصناف قرار پا چکی تھیں۔

کیفی کا ضخیم مجموعۂ کلام ''واردات'' کے نام سے 1941ء میں شائع ہوا۔اس مجموعۂ کلام میں اشعار کی تعداد تقریباً بارہ (12) ہزار ہے اور یہ بڑے سائز کی 512 صفحات کی کتاب ہے۔اس میں ابتدائی دور سے لے کر 1938ء تک کا کلام موجود ہے جس میں غزلیات، مثنویاں، رباعیات، مسدس، ترکیب بند، نظم مفرا و نیز فارسی کا کلام بھی شامل ہے۔اس مجموعہ کلام کے بارے میں مرزا خلیل احمد بیگ لکھتے ہیں:

''اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ مجموعہ اردو شاعری کی پچھلی آدھی صدی کی تبدیلی اور ترقی کی مختصر تاریخ ہے''۔

ایک اور جگہ سید ہاشمی فرید آبادی یوں رقمطراز ہیں:

''اس بارہ ہزار شعر کے گل دستے میں ہر شوق و مذاق کے پھول گندھے ہوئے ہیں''۔

کیفی کی وہ نظمیں جو 1947ء کے بعد لکھی گئی ان میں سے چند نظموں کا انتخاب کر کے رحمت قطبی نے ایک مجموعہ ''چند نظمیں'' کے نام سے شائع کیا۔اس میں زیادہ تر قومی اور وطنی نظمیں شامل ہیں۔نیز کیفی کی دو طویل مثنویاں ''جگ بیتی'' اور ''پریم ترنگنی'' بھی کتابی شکل میں شائع ہوئیں۔اس کے ساتھ ساتھ کیفی کی طویل معرکتہ آرا نظموں میں ''آئینہ ہند''، ''شوکت ہند''، ''ترانۂ حقیقت''، ''وداع گوتم''، ''صبح بہار''، ''باغ دل''، ''نالۂ عندلیب''، ''پور سکندر''، ''عالم آشوب''، ''عشق''، ''ساقی نامہ'' اور مجذوب کی بڑبڑ'' وغیرہ خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔یہ نظمیں ان کے مجموعہ کلام ''واردات'' میں شامل ہیں۔

کیفی کی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے ہوئی۔اٹھارہ سال تک کیفی قدیم رنگ میں ہی غزلیں کہا کرتے تھے یہ دوران کی شاعری کا پہلا اور ابتدائی دور ہے جو 1884ء تک قائم رہتا ہے۔اس عرصہ میں انھوں نے تقریباً سو ڈیڑھ سو کے قریب کچھ غزلیں کہیں جن میں زیادہ تر روایتی رنگ موجود ہیں۔ان میں نہ جذبہ کی تاثیر پائی جاتی ہے اور نہ ہی احساس کی شدت۔

خلیل احمد بیگ کے مطابق:

''بہ حیثیت مجموعی کیفی کی غزلیں ذہن پر وہ جمالیاتی تاثر نہیں چھوڑتیں جس کی ایک غزل گو شاعر سے توقع کی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ نقادوں نے ان کی شاعری کو ''بے رنگ''، ''بے تکلف'' اور ''خشک'' کہا ہے۔''

اس کے باوصف کیفی کے یہاں مترنم اور تغزل سے بھرپور اشعار بھی نظر آئے ہیں اور ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں واردات قلبی کی صحیح عکاسی کی گئی ہے۔

دور اول کی غزلوں کے چند منتخب اشعار:

یہ بھی تھا کیا کسی کا بند قبا — عقدہ قسمت کا اپنی وا نہ ہوا
مجھ کو افسوس ہے تو بس یہ ہے — کام مجھ سے کوئی بھلا نہ ہوا
آخر اس درد محبت کی دوا ہے کہ نہیں — یاالٰہی مری قسمت میں قضاء ہے کہ نہیں
وصل کا کرتا ہوں جب ذکر ان سے — اک تبسم تہ لب کرتے ہیں

کیفی کی شاعری کا بیشتر حصہ نظم نگاری پر مشتمل ہے۔ان کی شاعری کا دوسرا، تیسرا اور چوتھا دور نظم نگاری سے متعلق ہے جن میں قومی، وطنی، نیچرل، اخلاقی، ملی، سیاسی، اصلاحی، معاشرتی ہر قسم کی نظمیں شامل ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے ہیئتی اعتبار سے نئی تکنیک کا سہارا لیا اور شاعری کے نئے نئے سانچوں کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں مثنوی، مسدس، مخمس، مربع، ترکیب بند، معرا نظمیں اور

انگریزی طرز کے اسٹینزے (Stanzas) بھی موجود ہیں۔

نیچرل شاعری سے قطع نظر کیفی کی شاعری کا ایک بڑا حصہ قومی اور وطنی شاعری پر منحصر ہے۔ کیفی کو وطن سے سچا پیار تھا ان کا دل ہمیشہ حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار رہتا تھا۔ وطن عزیز پر جب بھی کوئی آفت آئے یا پریشانی آئے تو کیفی کا دل لرز اٹھتا تھا۔ حب الوطنی کے جذبہ سے مسحور ہو کر کیفی نے ایک نظم ''ترانہ وطن'' کے نام سے لکھی جس کا ایک شعر دیکھیے:

معبود ہے وطن، ہوں پرستار اس کا میں ۔۔۔ دیر و حرم میں جو جھکے یہ وہ جبیں نہیں

کیفی کو نوجوانان ہند سے بہت زیادہ توقعات وابستہ تھیں۔ وہ اپنی نظم ''وطن کے نوجوانوں سے خطاب'' کے ذریعہ نوجوانوں میں جذبہ بیداری اور جوش عمل پیدا کرنا چاہتے تھے۔ وہ کہتے ہیں:

نوجواں یہ یاد رکھ تمہید مستقبل ہے تو ۔۔۔ قوم گویا جسم ہے اس کا دماغ و دل ہے تو

جب تمھارا جذبۂ پنہاں عیاں ہو جائے گا ۔۔۔ نوجواں! بخت وطن بھی پھر جواں ہو جائے گا

ان نظموں کے علاوہ ''صبح وطن''، ''بھارت کی خبر لیجیے''، ''قومی عمارت''، ''صدائے کیفی''، ''قومی دہائی'' وغیرہ کا شمار کیفی کی معرکتہ آرا قومی و وطنی نظموں میں ہوتا ہے۔

چوں کہ کیفی ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے اس لیے انھوں نے کئی ایک نظمیں ہندو مسلم فساد سے متاثر ہو کر بھی لکھیں۔ آپ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ ہندو مسلم اپنے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کریں۔ وہ دونوں قوموں کے درمیان پیار محبت اور اتحاد و اتفاق کو ضروری گردانتے تھے۔ اس ضمن میں لکھی گئی نظموں میں ''بھارت ماتا کی فریاد''، ''ہندو مسلم فساد''، ''یہ کیا کر رہے ہو، یہ کیا ہو رہا ہے''، ''امن و اماں پیدا کریں'' اور ''دہائی'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ کیفی نے تاریخی واقعات اور شخصیات کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بتایا۔ دراصل کیفی کو قدیم تاریخ سے جذباتی لگاؤ تھا اس سلسلے میں ''معرکہ کرناٹک''، ''آثار قدیمہ''، ''پور سکندر''، ''آئینہ ہند'' اور ''شوکت ہند'' وغیرہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

بہرکیف دتاتریہ کیفی ایک ممتاز شاعر و ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ لسانی محقق اور ماہر زبان کی حیثیت سے بھی اردو ادب میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ آپ اردو زبان کے ایک جید عالم تھے۔ چاہے وہ نثر ہو یا نظم، ان کو ہر صنف میں عبور حاصل تھا۔ لسانیات کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی قواعد اور اصطلاح سازی پر بھی انھیں ملکہ حاصل تھا۔ الغرض کیفی نے اردو زبان و ادب کی بقا اور اس کے فروغ کے لیے خود کو صرف کر دیا اور اردو زبان و ادب کے فروغ میں ایک خاص مقام حاصل کیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر سمیہ تمکین
اسسٹنٹ پروفیسر (سی) اردو
ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی
موبائل: 9573969108

پدم بھوشن پروفیسر گوپی چند نارنگ

اردو کے دانشور و نقاد گوپی چند نارنگ کا آبائی وطن دُکی (ضلع) بلوچستان ہے۔ گوپی چند نارنگ یکم جنوری 1931ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام دھرم چند نارنگ اور والدہ کا نام محترم ٹیکان دیوی ہے۔ نارنگ صاحب کی والدہ سرائیکی زبان جانتی تھیں۔ سرائیکی اور قدیم اردو میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ اس طرح گوپی چند نارنگ کے گھر میں اردو کا بول بالا تھا۔ ان کے بڑے بھائی جگدیش نارنگ بھی اردو زبان و ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ گوپی چند نارنگ کی سنسکرت، فارسی اور اردو سے دلچسپی ان کے والد محترم اور برادر بزرگ ہی کی رہین منت ہے۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ 1952ء میں ایم۔اے۔ امتیازی نشانات کے ساتھ کامیاب کیا۔ ایم۔اے کی تعلیم ہی کے دوران نھوں نے اپنی بعض تخلیقات شائع کیں۔ اور دہلی کالج میگزین کے ''دلی کالج نمبر'' میں معاون مدیر کے فرائض بھی انجام دیئے۔ اب تخلیق سے ان کا رجحان تحقیق کی جانب مڑ گیا۔ چنانچہ 1964ء میں نقوش آپ بیتی نمبر میں لکھتے ہیں۔ ''میرا میدان تخلیق نہیں تحقیق ہے''۔ گوپی چند نارنگ نے 1956ء میں پی ایچ۔ ڈی میں داخلہ لیا اور 1958ء میں ''اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر'' کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ داخل دفتر کیا۔ جس پر اسی برس انہیں ڈاکٹریٹ کا مستحق قرار دیا گیا۔ اسی سال انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں آنرز کا امتحان امتیازی نمبرات سے کامیاب کیا۔

1957ء سے 1963ء تک گوپی چند نارنگ نے اردو لسانیات کے موضوع پر فکر و تحقیق کی جس کا نتیجہ ''اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو'' ارور ''اردوئے دہلی کی کرخنداری بولی'' کی صورت میں سامنے آیا۔ لسانیات سے گوپی چند نارنگ کی دلچسپی نے رنگ لایا اور 1963ء فروری میں انھیں وسکانسن یونیورسٹی (Viskansan University) میں بحیثیت وزیٹنگ پروفیسر خدمات انجام دینے کی دعوت دی گئی۔ انہوں نے یہاں جولائی 1965ء تک خدمات انجام دیں۔ یہاں انھوں نے اردو کی درس و تدریس کے علاوہ امریکن طلباء کے لئے جدید اصولوں پر مبنی اردو نصاب بھی ترتیب دیا۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے انعامات و اعزازات مندرجہ ذیل ہیں:

۱. پدم بھوشن کا قومی اعزاز 2004ء۔
۲. پدم سری کا قومی اعزاز 1990ء
۳. حکومت پاکستان کا اقبال صدی طلائی تمغہ امتیاز 1977ء
۴. غالب پرائز حکومت اتر پردیش 1963ء
۵. کامن ویلتھ فیلوشپ برائے لندن یونیورسٹی 1963ء
۶. اردو اکیڈیمی اتر پردیش انعام 1972ء
۷. میر ایوارڈ' میر اکیڈیمی۔ لکھنو۔ 1977ء
۸. بہار اردو اکیڈیمی 1979ء
۹. علی گڑھ مسلم یونیورسٹی المنائی واشنگٹن خصوصی ایوارڈ 1982ء

۱۰. اسوسی ایشن فار ایشن اسٹڈیز پنسل وینیا خصوصی ایوارڈ 1982ء

۱۱. خصوصی ایوارڈ بہار اردو اکیڈیمی 1983ء

۱۲. ساہتیہ کلا پریشد ایوارڈ لکھنؤ 1985ء

۱۳. غالب انسٹی ٹیوٹ ایوارڈ دہلی 1985ء

۱۴. ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ لکھنؤ 1985ء

۱۵. اردو سوسائٹی ٹورنٹو کنیڈا کا انٹرنیشنل ایوارڈ 1987ء

۱۶. نذر خسرو ایوارڈ میر خسرو ایوارڈ شکاگو 1987ء

۱۷. دہلی اردو اکیڈیمی خصوصی ایوارڈ برائے تحقیق و تنقید 1991ء

۱۸. اعزاز میر ایوارڈ میر اکیڈیمی لکھنؤ 1993ء

۱۹. مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ اتر پردیش اکیڈیمی 1993ء

۲۰. راجیو گاندھی ایوارڈ برائے سیکولرزم 1994ء

۲۱. ساہتیہ اکیڈیمی ایوارڈ ساختیات پس ساختیات 1995ء

۲۲. مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی کا سراج اورنگ آبادی ایوارڈ۔ 1999ء

۲۳. مکیش اکبر آبادی ایوارڈ (آگرہ)۔ 2000ء

۲۴. اردو مرکز انٹرنیشنل ایوارڈ (لاس انجیلس) 2000ء

۲۵. جشن گوپی چند نارنگ ایوارڈ نیویارک، واشنگٹن، شکاگو 2000ء

۲۶. قطر دوحہ فروغ اردو ایوارڈ 2002ء

۲۷. سنت گیانیشور ایوارڈ، مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی ممبئی 2004ء

۲۸. باپو ریڈی فاؤنڈیشن ایوارڈ، کلکتہ 2011ء

۲۹. بھارتیہ بھاشا پریشد ایوارڈ، کلکتہ 2011ء

۳۰. اقبال سمان ایوارڈ، اتر پردیش

۳۱. مورتی دیوری ایوارڈ (گیان پیٹھ ایوارڈ)

پروفیسر گوپی چند نارنگ اردو ادب کے ''اردو رتن'' تھے۔ ان کو ''جدید رتن'' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ رتن کہتے ہیں ہیرے کو۔ ہیرے میں جتنے رنگ ہوتے ہیں اتنے رنگ گوپی چند نارنگ کے ادب میں موجود ہیں۔ اردو ادب ان پر جتنا بھی ناز کرے بہت کم ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ سے اردو ادب چمکتا ہے۔ ہیرے کی چمک پوری دنیا میں مشہور ہے ویسے ہی ان کی شخصیت پوری دنیا میں مشہور ہے۔ پھولوں کا ہار بہت خوبصورت ہوتا ہے کیونکہ اس میں مختلف قسم کے پھول موجود رہتے ہیں۔ ویسے ہی گوپی چند نارنگ کی شخصیت ہے۔ ان کا اسلوب مختلف زبانوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہر زبان کا رنگ ان کے ادب میں ہے چاہے وہ ہندی ہو یا اردو، فارسی ہو یا انگریزی ہر زبان میں وہ ماہر لسانیات تھے۔ ان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ان کی تعریف ان چھوٹے سے الفاظ میں بیان کرتی ہوں:

اردو ادب کے ستارے ہیں
دکنی ادب کے دلدار ہیں
اردو ادب کے گل مہر ہیں
علمی سمندر کے انمول گہر ہیں

☆☆☆

ڈاکٹر نجم النساء ناز
لکچرر شعبہ اردو، یوگی ویمنا یونیورسٹی، کڈپہ
آندھرا پردیش۔ 516005
فون: 9985703574

ایلزبتھ کورین موناؔ-فن اور شخصیت

ایلزبتھ کورین موناؔ ایک معروف شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔ کئی زبانوں میں مہارت رکھتی ہیں۔ جن میں اردو، انگریزی، ہندی، تلگو اور ملیالم شامل ہیں۔ ان زبانوں میں وہ شاعری، نثر اور ترجمہ بآسانی کرلیتی ہیں۔

موناؔ کی مادری زبان ملیالم ہے۔ عیسائی مذہب سے تعلق رکھتی ہیں۔ موناؔ کے والدین کیرالا سے آکر حیدرآباد میں قیام پزیر ہوئے۔ موناؔ کی پیدائش حیدرآباد میں ہی ہوئی اور حیدرآبادی تہذیب کے زیرِ سایہ تعلیم و تربیت بھی ہوئی۔ حیدرآباد کے معروف مشن اسکول روزری کانونٹ میں انگلش میڈیم سے بنیادی تعلیم حاصل کی۔ معروفِ زمانہ نظام کالج سے B.Sc کی ڈگری حاصل کی۔ بچپن سے ہی انھیں احساس ہونے لگا تھا کہ شاعری کا ذوق اُن کے ذہن و دل میں پنپنے لگا ہے۔ شاعری کی شروعات انگریزی شاعری سے ہوئی۔ اسکول اور کالج کی میگزینوں میں ان کا کلام شائع کیا جاتا تھا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد Hyderabad , Reserve Bank of India میں ملازمت کرنے لگیں۔ Bank میں ہندی دیوس کے موقع پر کوئی سمیلن ہوا کرتا تھا جس میں حیدرآباد کے ہندی اور اردو شعرا کو مدعو کیا جاتا تھا۔ اسی دوران مونا نے ہندی کویتا لکھنے کی شروعات کی۔ حیدرآباد کی اردو اور ہندی انجمنیں جیسے ''محفلِ خواتین''، '' گیت چاندنی'' اور ''ساہتیہ سنگم'' میں شعر کہا کرتی رہیں اور آہستہ آہستہ ان کے اندر اردو شاعری کا ذوق پنپتا رہا۔ بالآخر انھوں نے قلم اٹھا لیا اور اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا نام نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان کی معروف شاعرات کی فہرست میں شامل ہونے لگا۔

شروعات میں موناؔ نے کنول پرشاد کنولؔ، حیدرآباد سے اردو غزل کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ وہ اردو سیکھنا چاہتی تھیں۔ انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ربط پیدا کیا اور بذریعہ خط و کتابت (Correspondence Course) کے ذریعہ اردو رسم الخط سیکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ انھوں نے اردو زبان پر مہارت حاصل کرلی۔ اسی دوران موناؔ کا تبادلہ حیدرآباد سے ممبئی ہوگیا۔ خوش قسمتی سے وہاں ایک استاد شاعر آر پی شرما مہرش سے ملاقات ہوئی جن سے انھوں نے علمِ عروض کی تعلیم حاصل کی۔

ممبئی میں قیام کے دوران موناؔ ادبی نشست اور مشاعروں میں شرکت کرتی رہیں جہاں ان کا تعارف مقامی شعرا سے ہوا۔ جن میں قابلِ ذکر علی سردار جعفری، ندا فاضلی، ابراہیم اشکؔ، ممتاز راشد اور مریم غزالہ وغیرہ شامل ہیں۔ ملازمت کے دوران انھیں ہندوستان کے مختلف علاقوں کا سفر کرنے کا بھی موقع ملا جہاں ان کی ملاقات بشیر بدرؔ، کرشن بہاری نورؔ اور کرامت علی کرامتؔ جیسے شعرا سے ہوئی۔ اور ان کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کرنے کا بھی شرف حاصل ہوا۔

چند سال بعد انھوں نے ملازمت کو خیرباد کہا اور ممبئی سے حیدرآباد آگئیں۔ اردو شاعری اور زبان سے دلچسپی تھی تو انھوں نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی کے کورس ''تحسینِ غزل'' میں داخلہ لیا۔ موناؔ کو مختلف زبانیں سیکھنے کا شوق تو تھا ہی' انھوں نے

Goethe Centrum, Hyderabad سے جرمن زبان سیکھی۔ وہ اب سُریانی زبان سیکھ رہی ہیں۔

حیدرآباد میں آکر انھیں اپنی تصنیفات، نثر میں مضامین اور شاعری کے مجموعے شائع کرنے کا وقت ملا۔ مختلف زبانوں میں لکھی گئیں پندرہ کتابیں شائع ہوئیں جن میں اردو کی پانچ کتابیں ہیں۔ جن کے نام (۱) کہکشاں (۲) محبت کے سائے (۳) ذوقِ جستجو (۴) قوسِ قزح اور (۵) بادل کا سایہ (ملیالم سے اردو میں مختصر کہانیوں کا ترجمہ) ہیں۔ انگریزی میں ان کی کتاب The Art and Science of Ghazal-A Reaer's guide to Urdu ghazal appreciation, Scansion and prosody ہے۔

ان کے انگریزی زبان میں شائع ہونے والے مجموعہ Beyond Images کا ترجمہ فرنچ اور ٹامل زبان میں کیا گیا۔

اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش، تلنگانہ اور لکھنو سے اُن کی شائع شدہ کتابوں پر انہیں انعامات سے بھی نوازا گیا تھا، یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اُن کا ایک انگریزی غزلوں کا مجموعہ اور اردو شاعری کا ایک مجموعہ ابھی زیرِ اشاعت ہے۔

موؔنا کو کئی آل انڈیا مشاعروں میں شرکت کا موقع بھی ملا جن میں قابلِ ذکر ادبی ٹرسٹ کا مشاعرہ (حیدرآباد) اور جشنِ ریختہ (دہلی) ہیں۔ ان کا کلام، نثری مضامین، انٹرویوز اور ویڈیوز انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں۔

موؔنا کی شاعری میں سادگی اور گہرائی ہے۔ مونا عصرِ حاضر کی ایک نمائندہ شاعرہ ہیں۔ وہ حالاتِ حاضرہ سے متاثر ہوکر شعر کہتی ہیں۔ موؔنا کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

بات کرتی نہیں صرف محبوب کی
وقت کے ساتھ اب چل رہی ہے غزل

ooo

کمانے پیسے وہ پردیس بس گیا جاکر
وطن میں بکنے کو اس کا مکان باقی ہے

ooo

شدتِ غم میں بھی مونا مسکرائے جا سدا
اب تو تیری مسکراہٹ ہی تیری پہچان ہے

دکنی زبان میں کہا گیا ایک شعر:

مندر جاتیئں، مسجد جاتیئں یا نیں جاتیئں
اپناچ ہے ایشور اللہ دنگا کیکو

موؔنا سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ آئندہ بھی اپنا ادبی سفر جاری رکھیں گی تا کہ آنے والی نسلیں مستفید ہوتی رہیں۔

☆☆☆

تسنیم جوہؔر
رونق۔۔ 509/J/1
اسٹیٹ نمبر 86، جوبلی ہلز، حیدرآباد 096 500 (تلنگانہ)

رباعی

اللہ ! بلند تر ہے سب سے تری ذات
ادنیٰ بندہ ہوں میں مری کیا اوقات
خورشید سے ذرے کو ہے لیکن نسبت
سب فکروں سے یارب مجھے ملجائے نجات

مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ

مضامین

فراق گورکھپوری

اردو شاعری کی گیسوؤں کو سنوارنے میں مسلم اور مسلم غیر مسلم شعراء ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے ہیں اور اپنی طاقت کے مطابق اردو شاعری کو خوب سے خوب تر بنانے کی جدوجہد میں مسلسل لگے رہے۔ آزادی سے پہلے کا دور ہو کہ بعد کا دور چمن اردو کی باغبانی مسلم و غیر مسلم شعراء نے مل کر کی۔ غزل کا گلاب ہو، نظم کے مہکتے پھول، رباعی کی رنگ برنگی کلیاں ہو کہ مثنوی کے گل نسترن، قصیدہ کا کنول ہو کہ مثنوی کی چمپا، ان کے رنگوں کو اور خوب صورت بنانا، ان کی مہک سے مشام جاں کو معطر کرنے میں سب کا حصہ رہا ہے اور رہے گا۔ قومی زبان کے تازہ شمارے کی مناسبت سے جو اردو کے غیر مسلم شعرا کے حوالے سے شائع کیا جا رہا ہے ایک مختصر مضمون فراق گورکھپوری پر پیش خدمت ہے ملاحظہ فرمائیں۔

فراق گورکھپوری اردو کے جانے مانے شاعر ہیں۔ جنہوں نے صنف غزل کے علاوہ نظموں اور رباعیات کے ذریعے اپنی مخصوص شناخت بنائی۔ وہ تھے انگریزی کے استاد لیکن شاعری اردو میں کرتے تھے۔ اپنے وقت کے شاعروں میں ان کا رتبہ بہت بلند ہے۔ فراق کا خاندان کائستھوں کا خاندان تھا۔ فراق ۱۸ آگست ۱۸۹۶ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد گورکھ پرشاد عبرت ممتاز وکیل اور شاعر تھے۔ حسن فطرت کے نام سے ہمیں ان کی مثنوی ملتی ہے اور ان کے بعض اشعار فراق کے ذریعے ہم تک پہونچتے ہیں لیکن ان کی یہ مثنوی ناپید ہے۔ ان کی والدہ عبرت کی تیسری بیوی تھیں، عبرت نے یکے بعد دیگرے بیویوں کے انتقال کے بعد تین شادیاں کیں۔ فراق نے ابتدائی اردو ہندی کی تعلیم اپنے گھر پر ہی اپنے والد سے حاصل کی۔ ۹ سال کی عمر میں ان کا داخلہ ماڈل اسکول گورکھپور میں ہوا مگر ایک سال بعد وہ گورکھپور مشن اسکول منتقل ہو گئے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ جبلی اسکول میں داخل کئے گئے۔ ۱۹۱۲ء میں انہوں نے یہیں سے اسکول لیونگ سرٹیفکٹ حاصل کی اور ایف اے کرنے کرنے لئے الہ آباد چلے گئے۔ ۱۹۱۵ء میں نے انہوں نے ایف اے پاس کیا۔ ۱۹۱۸ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کیا اور پورے صوبے میں چوتھی پوزیشن حاصل کی۔

بعد ازاں انہوں نے آئی سی ایس کا امتحان پاس کیا اور ڈپٹی کلکٹر کے لئے نامزد ہو گئے لیکن انہوں نے اس نوکری سے استعفی دے دیا کیونکہ وہ گاندھی کی نظریات سے متاثر ہو چکے تھے۔ یہ فراق صاحب کی بہت بڑی قربانی تھی جسے اس وقت کے اخبارات و رسائل نے بہت سراہا خاص کر ہندی کے کانگریسی ہفتہ سودیش نے ان کا بھرپور استقبال کیا۔ اس کے بعد انہوں نے جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا اور گرفتار کر لئے گئے۔ ڈیڑھ سال قید کی سزا ہوئی ان کے ساتھ جیل جانے والوں میں خواجہ عبدالحمید، مولانا عارف ہنسوی، اور گاندھی جی کی سکریٹری مہادیو دیسائی قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے ہی جیل میں طرحی مشاعروں کی روایت شروع کی۔

ایک سال بعد ہندوستان کے سیاسی قیدی رہا کر دئے گئے جن میں فراق بھی تھے۔ اس کے انہوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے انڈر سکریٹری کی حیثیت سے جوائن کیا وہاں پانچ سال کام کیا بعد ازاں کرسچین کالج لکھنو اور سناتن دھرم کالج کانپور میں استاد کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا۔ ۱۹۳۰ء میں آگرہ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا اور وہیں شعبہ انگریزی کے استاد مقرر ہو گئے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۵۸ء کو سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد یو جی سی کی طرف سے نیشنل ریسرچ پروفیسر کا عہدہ انہیں دیا گیا جس پر انہوں نے ۱۹۶۶ء تک کام کیا۔

فراق نے شاعری کی مختلف اصناف میں اپنا کمال دکھایا۔ ان کی غزل، نظم، رباعی پر ناقدین نے خصوصی توجہ دی اور اپنی تنقید کا موضوع بنایا۔ فراق کی بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے چند کتابوں کے نام یوں ہیں:

اندازے، چراغاں، دھرتی کی کروٹ، غزلستان، گلبانگ، گل نغمہ، گلہائے پریشاں، گل کاریاں، ہزار داستاں، حاشئے، مشعل، من آنم، نغمہ نما، پچھلی رات، روح کائنات، رمز و کنایات، شعرستان، شعلہ ساز، شبنمستان، اردو غزل گوئی، اردو کی عشقیہ شاعری وغیرہ۔

ان کتابوں میں گل نغمہ اور روپ کی رباعیات کو بہت شہرت نصیب ہوئی۔

فراق کی شخصیت اور شاعری پر بھی بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں سے چند کے نام ہیں:

باتیں فراق سے، فراق اور نئی نسل، فراق گورکھپوری شخصیت، شاعری اور شناخت، فراق گورکھپوری ذات وصفات، فراق گورکھپوری شاعر نقاد و دانشور، فراق گورکھپوری شخصیت وفن، اردو نقاد کی حیثیت سے فراق کا جائزہ، فراق گورکھپوری شخصیت وفن، اردو نقاد کی حیثیت سے فراق کا جائزہ، فارق کی شاعری، فراق دیارشب کا مسافر، فراق صدی کی آواز، مطالعہ رباعیات فراق گورکھپوری، شاعر ہند فراق گورکھپوری، یادفراق، فراق شاعر اور شخص وغیرہ۔ بہت سی رسالوں نے فراق کی شخصیت پر خصوصی شمارے شائع کئے اور ان کی شخصیت وشاعری کو خراج تحسین پیش کیا جیسے ایوان اردو، رسالہ جامعہ، شاہکار، اردوادب اور نیادور۔ لیکن شاہکار نے جو خاص شمارہ ان پر شائع کیا ہے وہ بہت ہی لاجواب ہے اس میں لکھنے والے بہت بڑے بڑے نام ہیں جیسے نیاز فتح پوری، سید احتشام حسین، مولانا عبدالماجد دریابادی، حسن عسکری، اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، عبدالقادر سروری، مجنوں گورکھپوری، سید صفدر حسین، عزیز احمد، نظیر صدیقی، شاذ تمکنت، وحید اختر، فضیل جعفری، ڈاکٹر سیدہ جعفر، جمیل جالبی، سلام سندیلوی وغیرہ۔

اردو کے بڑے شعرا میں ہم فراق کا شمار کرتے ہیں جنہوں نے اپنے مخصوص اسلوب سے اردو شاعری کو مالا مال کیا ہے۔ ان کی ابتدائی غزلوں سے قطع نظر ہمیں بعد کی غزلوں میں ہندوستانیت اور اس کی کلاسیکی روایات، انگریزی کے تجربات ہمیں ملتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ انگریزی ادب کے شناور تھے۔ انگریزی ادب کو خوب پڑھا تھا اور سمجھا تھا۔ اس لئے ترسیل میں بہت کامیاب ہوئے ہیں۔

میری زندگی کی دھوپ چھاؤں کے عنوان سے فراق نے اپنے بارے میں لکھا ہے وہ تمام سوانح نگاروں کے لئے مرجع ہے۔ یہ مضمون مختصر ہے مگر پڑھنے کے لائق ہے جس میں فراق نے اپنے ذہنی سفر کے بارے میں اور اپنی نفسیاتی الجھنوں کے بارے میں بہت کھل کر لکھا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

''ایک نازک اور دردناک المیہ میری زندگی کا یہ رہا ہے کہ ازدواجی زندگی کا غم زہر کی طرح میری رگ رگ، ہر گوشت پوست اور میرے پورے وجود پر اس طرح مسلط ہو چکا تھا کہ باپ کا مرنا، دودو جوان بھائیوں کا مرنا، جوان بیٹی کا مرنا، ایک بدنصیب خبط الحواس بیٹے کی زندگی اور عین جوانی میں اس کی خودکشی یا کسی بھی دوسرے غم انگیز واقعے سے بھرپور انداز میں کھل کر متاثر ہونے کی صلاحیت مجھ میں باقی نہیں رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ازدواجی زندگی کا مسلسل اور مستقل طور پر میرا گلا گھونٹ رہا ہے اور اسی حالت میں دوسرے ایسے سانحوں کا احساس کراتے تھے کہ اس احساس کی دولت سے محروم ہی رہنا پڑتا تھا''۔ (شاہکار، فراق نمبر، ص ۴۰۷)

سانحے سہتے سہتے فراق کے اندر خوشی اور مسرت محسوس کرنے کی حس بھی ختم ہوگئی اسی مضمون میں انہوں نے آگے اشارہ کیا ہے کہ ایف اے کے امتحان میں چوتھی پوزیشن حاصل کرنا، بی اے کے امتحان میں چوتھی پوزیشن لانا، کامیاب سے کامیاب شعر پر زبردست داد پانا، دوسروں سے اپنی تعریف سننا، پنڈت جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی کی قدردانی، ہمت افزائی اور ملک بھر میں مشہور ہوجانا۔ یہ بہت بڑی خوشی کے مواقع تھے لیکن یہ تمام باتیں ان کے حق میں زہر آلود شربت بن جاتی تھیں۔

اسی غم سے پیچھا چھڑانے کے لئے انہوں نے شاعری کا سہارا لیا اور خوب شاعری کی۔ اپنی ابتدائی زندگی کا واقعہ اسی مضمون میں بیان کرتے ہیں کہ بےخوابی اور تنہائی میں ایک روز متذکرہ فانی کے مطلع سے تحت الشعوری طور پر متاثر اور محرک ہوکر غزل کہنی شروع کردی جس کا مطلع ہے:

نہ سمجھنے کی یہ باتیں ہیں نہ سمجھانے کی
زندگی اچٹی ہوئی نیند ہے دیوانے کی

صبح تک یہ غزل ہوتی رہی یوں ہی رات کٹ گئی۔

اس مضمون میں انہوں نے اپنے بھائی کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا ہے اور اپنے والد کے عبرت کے چند شعر بھی پیش کئے ہیں۔ جس میں سے ایک شعر سن کر مولانا حسرت موہانی نے کہا تھا کہ یہ شاعری نہیں الہام ہے اور وہ شعر یوں ہے:

زمانے کی گردش سے چارہ نہیں ہے
زمانہ ہمارا تمھارا نہیں ہے

اب ان کی غزل کے متعلق چند باتیں پیش کر کے اپنا مضمون ختم کروں گا۔

فراق بے شک غزل کے شاعر ہیں ان کا جوہر غزل میں ایک عجیب انداز سے نمایاں ہوکر سامنے آتا ہے اور پوری شدت سے ان کی غزل ہم سے خطاب کرتی ہے۔ان کی شاعری انہیں اردو کے بڑے شاعروں میں شامل کراتی ہے۔ان کا احساس جمال سب سے منفرد ہے وہ عشق کے بھی شاعر ہیں اور حسن کے بھی۔اپنی جمال پرستی کے بارے میں خود لکھا ہے کہ میں بدصورت مرد یا عورت کی گود میں بھی نہیں جاتا تھا۔یہی فراق ان کی غزل میں جا بجا نظر آتا ہے۔ان کے حسن و جمال کا ایک معیار ہے۔اردو کے ناقدوں نے جیسے شمس الرحمٰن فاروقی اور گیان چند جین نے انہیں بڑا شاعر ماننے سے انکار کردیا ہے۔جگن ناتھ آزاد کہتے ہیں کہ فراق غزل کے اچھے اور بہت اچھے شاعر ہیں۔اس سے زیادہ نہیں۔ان کی غزلوں سے چند شعر سنیں اور بتائیں کہ کیا یہ بڑی شاعری نہیں ہے؟

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہوگئی ہے

زندگی کو بھی منہ دکھانا ہے
رو چکے ترے اشکبار بہت

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی
یہ حسن وعشق تو دھوکا ہے سب مگر پھر بھی

دھرلیا ہے کسی نے سیتا
زندگی جیسے رام کا بن باس

ہم سے کیا ہوسکا محبت میں
خیر تم نے بے وفائی کی

سوز نہاں میں وہ قرار، قلب تپاں میں وہ صفا
شعلہ تو تھا تڑپ نہ تھی، سر پر یہ آسماں نہ تھا

دنیا دنیا غفلت طاری عالم عالم بے خبری
حسن کا جادو کون جگائے ایک زمانہ سوتا تھا

☆☆☆

ظہیر دانش عمری
ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی
مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، گچی باؤلی
حیدرآباد 032 500 (تلنگانہ)
سیل: 9701065617

پنڈت جگن ناتھ آزادؔ کی اُردو خدمات ایک جائزہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ زبان نہ کسی مذہب اور نہ کوئی سرحد کی اسیر ہوتی ہے۔ بلکہ زبان تو مذہب ذات اور سرحد کی حد بندیوں سے بالاتر ہوتی ہے۔ البتہ کچھ زبانیں اور بولیاں بعض مخصوص طبقات کے لئے مختص ہوگئی ہیں تو کچھ زبانوں کو مذاہب سے منسوب کر کے ان زبانوں کا عرصہ حیات تنگ کیا گیا ہے۔ اُردو زبان بھی اس ستم ظرفی سے اپنا دامن بچا نہ سکی۔ اُردو کے دامن پر یوں تو لشکری زبان اور شاہی بلکہ درباری زبان تک کے بھی الزامات عائد کئے گئے اور اب موجودہ صورتحال میں اردو زبان کو مسلمانوں سے منسوب کرتے ہوئے اس کے فروغ میں رکاوٹیں حائل کی جارہی ہیں۔ حالانکہ اُردو زبان کی تاریخ غیر مسلم شعرا اور ادباء کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ فراقؔ گورکھپوری سے لے کر لتا حیاء تک سینکڑوں غیر مسلم شعرا نے اُردو زبان وادب کی آبیاری کی ہے۔ ان ہی غیر مسلم شعراء کی فہرست میں ایک نام پنڈت جگن ناتھ آزادؔ صاحب کا بھی ہے۔ اتفاق کہیں یا حسن اتفاق کے ہندوستان میں اُردو زبان کو مسلمانوں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ جبکہ اس زبان کی خدمات میں مسلمانوں سے زیادہ کارنامے غیر مسلموں کے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے سربراہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ سے لے کر پروفیسر پنڈت جگن ناتھ آزادؔ تک سینکڑوں نام موجود ہیں۔

پنڈت جگن ناتھ آزادؔ 5 / ڈسمبر 1918ء کو ہندوستان کے عظیم شاعر تلوک چند محرومؔ کے گھر پیدا ہوئے۔ اس وقت وہ مغربی پنجاب کے ایک مشہور قصبہ عیسی خیل میں مقیم تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم والد کی نگرانی میں گھر پر ہوئی اور وسطانیہ کی تعلیم عیسی خیل اور کلور کورٹ کے اسکولوں میں ہوئی۔ جبکہ 1933ء میں رام موہن رائے ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ 1937ء میں گارڈون کالج راولپنڈی سے بی۔اے کا امتحان کامیاب کیا۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے 1944ء میں ایم۔اے فارسی کیا۔ اور 1945ء میں ایم او ایل کیا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز صحافت اور تدریس سے کیا۔ وہ مشہور ادبی ماہنامہ ''ادبی دنیا'' کے 6 ماہ قائم مقام ایڈیٹر رہے۔ اس کے بعد ایک سال کے لئے اُردو روزنامہ ''جئے ہند'' لاہور کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کے طور بھی کام کیا۔ بعدازاں وہ ڈی اے وی کالج لاہور میں اُردو کے استاد مقرر ہوئے۔ جہاں وہ تقسیمِ ہند کے المیہ تک خدمات انجام دیتے رہے۔ تقسیم ہند کے المناک حادثہ کے بعد وہ بادل ناخواستہ کی طرح ہندوستان منتقل ہوئے اور روزنامہ ''ملاپ'' نئی دہلی کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ جبکہ 1948ء میں ہندوستان کے محکمہ اطلاعات ونشریات کے افسر مقرر ہوئے۔ اور 1977ء تک اسی محکمہ کے کئی اعلی عہدوں پر ملک کے مختلف شہروں میں خدمات انجام دیں۔ 1977ء میں وظیفہ حسن خدمات پر سبکدوشی کے بعد 1977ء تا 1983ء تک جموں یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔ جبکہ اسی دوران 1980ء تا 1983ء تک اسی یونیورسٹی میں انہیں فیکلٹی آف لرننگ کی اضافہ ذمہ داریاں بھی عائد

مضامین

کی گئیں تھیں۔

پنڈت جگن ناتھ آزاد کی اُردو خدمات زبان کے فروغ میں ایک اہم سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔ تقسیمِ ہند کے المیہ کا ایک بڑا فائدہ ہندوستان کو پنڈت جگن ناتھ آزاد کا بھارت کے حصہ میں آنا تھا۔ پنجاب میں پیدا ہونے والا عظیم الشان شاعر تقسیمِ ہند کے المیہ میں ہندوستان کو نصیب ہوا تھا- حالانکہ اس المیہ کی وجہہ سے بھارت کئی ایک اردو اہل قلم سے محروم بھی ہو چکا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پنڈت جگن ناتھ آزاد کو اپنے وطن عزیز سے بے پناہ محبت بھی تھی۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ 14/ اگسٹ 1947ء کو قیام پاکستان کے اعلان کے بعد ریڈیو پاکستان سے جو ترانہ نشر ہوا ''اے سرزمین پاک !'' پنڈت جگن ناتھ آزاد کا ہی لکھا ہوا تھا۔ پنڈت جگن ناتھ آزاد ایک عظیم شاعر کے علاوہ ایک نامور مصنف بھی تھے۔ ان تحریر کردہ کتابوں (شعری مجموعوں اور نثری تصانیف) کی تعداد تقریباً 50 سے زائد ہے۔ جن میں قابل ذکر طبل وعلم ۔ 1948ء ۔ بیکراں 1949ء ۔ستاروں سے ذردوں تک 1953ء ۔گہوارہ علم وہنر 1989ء ۔تلوک چند محروم ۔ جنوب ہند میں دو ہفتے ۔ اقبال اور مغربی مفکرین ۔ اقبال اور کشمیر اور مرقعِ اقبال ان کی مشہور تصایف ہیں۔

پنڈت جگن ناتھ آزاد نے کئی نظمیں کہی ہیں۔ جن میں چند نظمیں بہت مشہور ہوئی ہیں۔ جن میں اردو۔ ابوالکلام ۔ شاعر کی آواز ۔ دلی کی جامع مسجد۔ اپنے وطن میں اجنبی وغیرہ۔ دلی کی جامع مسجد اور بھارت کے مسلمان ان کی شہرہ آفاق نظمیں ہیں۔ پروفیسر آزاد نے ہند اور بیرون ہند کئی یونیورسٹوں میں مقالات پیش کئے ۔صدارتی خطاب کیا۔ جن میں قابل ذکر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد ۔ کشمیر یونیورسٹی سری نگر ۔ شاہ حسین کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور، پاکستان ۔ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن پاکستان ۔ بہار اُردو اکیڈیمی ۔ راجستھان اُردو اکیڈیمی راجستھان ۔ادبی مرکز لندن ۔ ماسکو یونیوسٹی ماسکو ۔ کراچی یونیورسٹی کراچی ۔ تاجکستان یونیورسٹی۔ ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی شکاگو اور بحرین یونیورسٹی بحرین میں انہوں نے صدارتی خطاب کیا۔ مقالات پڑھے بلکہ اپنے ملک کی نمائندگی کی ۔ پنڈت آزاد کا سب سے بڑا کارنامہ علامہ اقبال پر تحقیق ہے۔ وہ ماہر اقبالیات کی حیثیت سے اُردو ادب میں شہرت رکھتے ہیں ۔ ملک و بیرون ملک کی تقریباً 34 علمی و ادبی انجمنوں کی وہ رکنیت اور صدارت کا انہیں اعزاز حاصل تھا۔ وہ اقبال میموریل ٹرسٹ کے 1981ء تا 1985 تک صدر رہے ۔ انجمن ترقی اردو کے نائب صدر اور صدر۔ پروفیسر پنڈت جگن ناتھ آزاد کی خدمات پر انہیں ہندوستان اور دیگر ممالک خصوصاً پاکستان وغیرہ کے جملہ 40 سے زائد ایوارڈ حاصل ہوئے تھے۔ جن میں ہندوستان کا ایک نامور ایوارڈ ''غالب ایوارڈ'' اور پاکستان کا اقبال میڈل ایوارڈ بھی شامل ہے۔ ہندوستان کی تقریباً یونیورسٹیوں میں اب تک کئی اسکالرس نے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی حیات اور خدمات ۔ شخصیت اور شاعری پر تحقیق کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی بھی جاری ہے۔ اس میں پہلا نام رضوان اللہ صاحب کا ہے کہ جنہوں نے ''جگن ناتھ آزاد کی ادبی خدمات'' کے عنوان پر تحقیقی مقالہ تحریر کیا۔ جس پر انہیں بہار یونیورسٹی مظفر پور نے

مضامین

1985ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری عطاء کی۔

علامہ اقبالؔ کی نظم شکوہ جواب شکوہ اور حفیظ جالندھری کی نظم ''شاہ نامہ اسلام'' کی طرح پنڈت جگن ناتھ آزادؔ کی دو نظمیں بھارت کا مسلمان اور وطن میں اجنبی بھی بہت مشہور ہوئی ہیں۔ تقسیم ہند کے المیہ کے بعد بھارت کے مسلمان جس عظیم کشمکش سے دوچار تھے اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں پر خوف کا عالم یہ تھا کہ وہ اپنے مرنے والے قریب بھی بیٹھ کر کھل کر نہیں رو سکتے تھے کہ کہیں انہیں پاکستان جانے والوں کا رشتہ دار نہ سمجھ لیا جائے اور جو پاکستان منتقل ہو رہے تھے وہ اپنی دولت، جاگیر اور زمین کوڑیوں کے مول فروخت کر کے پرندوں کی طرح صرف اللہ کی مدد کے سہارے اپنے گھر بار کو چھوڑ کر مکان سے لامکاں کی طرف منتقل ہو رہے تھے۔ تذبذب کا یہ حال تھا کہ مسلمانوں کا مستقبل نہ ہند میں محفوظ تھا اور علاقہ ہند کے مسلمانوں یا مہاجروں کے ساتھ انصار کے بہتر رویہ اور انکے پاکستان میں بہتر مستقبل کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایسی صورتحال میں ایک ہندو شاعر پنڈت جگن ناتھ آزادؔ صاحب نے ''بھارت کے مسلمان'' کے نام ایک طویل نظم لکھ کر ساری دنیا کو خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔

بہرحال ہندوستان میں جگن ناتھ آزادؔ کی شاعری اور ان کی شخصیت کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ان کی شخصیت اور شاعرانہ کمالات کو ملک میں بہت عزت ملی۔ شاعری کے علاوہ اقبالؔ سے ان کے تعلق خاطر نے انہیں شہرت دوام عطا کی۔ ان کی شاعری میں حیات و کائنات کو فلسفیانہ انداز میں سمجھنے کی کوشش ملتی ہے۔ ہندوستان میں اقبالیات کے فروغ کے لئے جو کام آزاد صاحب نے کیا وہ ان ہی کا حصہ تھا۔ انہوں فکر اقبال کو اصلی معنوں میں ہندوستان میں روشناس کروایا۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے اپنی ایک تحریر میں انہیں ''اقبال کا غیر مسلم خادم'' کا خطاب دیا تھا اور پنڈٹ جگن ناتھ آزاد نے ماہر اقبالیات کی حیثیت سے دنیا بھر میں بھارت کے سفیر کا کردار ادا کیا۔ جگن ناتھ آزاد ماہر اقبالؔ، نقاد دانشور، ماہر تعلیم، خاکہ نگار اور ادیب کے طور بھی بڑا مقام رکھتے ہیں۔ لیکن ان کا شاعر ہونا اولین وصف رہا۔ بالاخر 24 / جولائی 2004 کو جگن ناتھ آزاد نے راجیو گاندھی کینسر انسٹیٹیوٹ نئی دلی میں آخری سانس لی۔

دنیا تیرے قرطاس پہ کیا چھوڑ گئے ہم
اک حُسن بیان حُسن ادا چھوڑ گئے ہم
ماحول کی ظلمات میں جس راہ سے گذرے
قندیل محبت کی ضیاء چھوڑ گئے ہم

☆☆☆

محمد محبوب
پی ایچ، ڈی۔ ریسرچ اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد
فون نمبر 9440777782

منتخب اشعار

جب دعائیں بھی کچھ اثر نہ کریں
کیا کریں صبر ہم اگر نہ کریں
داستاں ختم ہو ہی جائے گی
آپ قصہ کو مختصر نہ کریں
یہ بھی تشہیر شاعری ہے جوشؔ
آپ دیوان مشتہر نہ کریں

جوشؔ ملسیانی

مضامین

اُردو کا مخلص ادیب۔۔۔کالی داس گپتا رضاؔ

مرزا غالبؔ تقریباً ہر محقق کا محبوب موضوع رہا ہے۔کالی داس گپتا رضاؔ کا شمار بھی ان محققین میں ہوتا ہے۔ان کی زیادہ تر تحقیق غالبؔ سے متعلق ہیں۔ایک اچھے محقق ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے اور شاعری سے ان کو کافی لگاؤ تھا۔بچپن سے ہی آپ کو مطالعہ کا کافی شوق تھا جس نے انہیں تحقیق کی طرف مائل کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا شمار اردو کے اہم محققین میں کیا جانے لگا۔ان کے تحقیق کا محور خصوصاً غالبیات رہا اور اس کے علاوہ انہوں ذوقؔ اور چکبستؔ پر بھی تحقیقی کام کیا۔غالبیات چوں کہ ان کے تحقیق کا خاص محور تھا اس لئے انہوں نے غالبؔ پر کئی کتابیں تحریر کیں جن میں خاص طور پر متعلقات غالبؔ، غالبیات: چند عنوانات، دیوان غالبؔ، انتخاب، رقعات و اشعار غالبؔ، غالبؔ کی بعض تصانیف کے بارے میں وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔مذکورہ تصانیف میں ''متعلقات غالبؔ اور غالبؔ چند عنوانات'' اہم تحقیقی کتابیں ہیں۔متعلقات غالبؔ میں انہوں نے سید وزیر الحسن کے اس دعوے کو مسترد کر دیا کہ دہلی میں ۱۸۵۷ء کے قریب ایک نعتیہ مشاعرہ ہوا تھا جس میں کئی شعرا نے تضمین پڑھی تھیں۔انہوں نے نہ صرف ایسے مشاعرہ کے منعقد ہونے کی تردید کی بلکہ اپنے اس مضمون میں ادبی سرقہ کرنے والوں کو بے نقاب بھی کیا۔

کالی داس گپتا رضا کی پیدائش ۲۵/اگست ۱۹۲۵ء کو ہوئی۔ ماہر غالبؔ ہونے کی حیثیت سے انہیں ۱۹۸۷ء میں غالبؔ ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔۲۰۰۱ء میں حکومت ہند نے انہیں پدم شری اعزاز سے نوازا۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں ان کا قیام رہا لیکن تجارت کی غرض سے مشرقی افریقہ بھی جانا ہوا۔سیر و تفریح اور تجارت کے بعد زندگی کا بڑا حصہ ممبئی میں گزارا وہاں ان کا ادبی حلقہ کافی وسیع تھا۔وہ ہمیشہ علم کی تلاش میں محو رہتے تھے اور تحقیق کے سمندر میں ڈوبے ہوئے نظر آتے تھے۔انہیں اردو شعر و ادب سے جتنا لگاؤ تھا شاید ہی کسی دوسرے ادیب کے ہاں دیکھنے کو ملے گا۔اگر چہ وہ پیشے سے تاجر تھے مگر ان کا علمی و تحقیقی ذوق ایسا رچا ہوا تھا کہ ہمہ وقت علمی و تحقیقی کاموں میں منہمک رہتے تھے۔انسان دوستی، بھائی چارہ اور مہمان نوازی میں بھی بڑا دل رکھتے تھے۔زندگی کے آخری ایام تکلیف اور مشکلات میں گزارے۔یہ ادبی ستارہ ۲۱/مارچ ۲۰۰۱ء کو دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

دیوان غالبؔ کی تدوین کالی داس گپتا رضا کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔غالبؔ کی وفات کے تقریباً سو برس بعد بھی ان کے کلام کا کوئی مستند مجموعہ منظر عام پر نہیں آ سکا تھا۔اس سلسلے میں انہوں نے کافی محنت اور تحقیقی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے صحیح مجموعہ لانے کی کوشش کی اور دیوان غالبؔ کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۶ء میں شائع کیا۔اس میں غالبؔ کے کلام کو تدوین متن کے اصولوں پر رکھ کر پیش کیا ہے۔

موصوف نے اپنی کتاب 'سہو و سراغ' میں کئی تحقیقی مضامین لکھے جن میں چند قدیم مرثیہ گو، قدیم ہندو شعرا کی چند نعتیں، مثنوی مولوی معنوی کا ایک مطبوعہ نسخہ، چکبست اور طنز و مزاح بہت مقبول ہوئے۔اس کے علاوہ انہوں نے اپنی کتاب ''چند مشہور شعر اور ان کے خالق'' میں اپنی تحقیق سے ان مشہور اشعار کے خالق کا بتایا جو کہ دوسروں سے منسوب کئے جاتے تھے۔اس طرح ان کے تحقیقی کارناموں کو اگر موضوع کے اعتبار تقسیم کیا جائے تو الفاظ کی تحقیق، مفروضات کی تحقیق اور غالبؔ و چکبست جیسی شخصیتوں اور ان کے فن پاروں کی بازیافت پر کیا جا سکتا ہے۔بقول شمیم طارق: ''تخلیق و تحقیق دونوں دائروں میں وہ (گپتا رضا) انسانی وجود کی طرح جملہ میلانات و رجحانات کو تغیر پذیر مانتے ہوئے تخلیق و تحقیق دونوں کے نتائج کو پلٹ پلٹ کر دیکھنے اور اس کا Evaluation کرتے رہنے کے عادی ہیں۔ان کی تخلیقی بینائی، تبصروں، تنقیدوں اور قدروں یا نظریوں کے وقتی ہنگامی معیاروں کو حرفِ آخر نہیں سمجھتی بلکہ ازلی ابدی صداقتوں کو وقت اور حالات کی ضرورت و رفتار کے مطابق تبدیل کر کے اپنا لینے کی قائل ہے۔'' (شمیم طارق، کالی داس گپتا رضا، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، اشاعت ۲۰۰۴، ص ۲۶)

کالی داس گپتا رضا ایک بہترین شاعر بھی جانے جاتے تھے۔وہ استاد شاعر جوش ملسیانیؔ کے شاگرد تھے، اپنے استاد کی ہمیشہ قدر کی اور بڑے ادب و احترام کے ساتھ ان کا نام لیتے تھے۔کالی داس گپتا رضا کی شاعری زندہ جاوید تھی، انہوں نے غزلیں بھی کہیں اور رباعیاں بھی۔شاعری میں ان کی نسبت دبستان داغؔ سے جا کر ملتی ہے کیونکہ جوش ملسیانی استاد داغؔ کے شاگرد تھے۔اسی فیضان سے کالی داس گپتا

رضا بھی زبان و بیان پر قدرت رکھتے تھے۔ان کی غزلوں میں بے ساختگی ، روانی اور تسلسل پایا جاتا ہے۔غزل ،نظم ،قصیدہ ، رباعی غرض ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور کامیاب بھی رہے۔ان کا پہلا شعری مجموعہ'' شعلۂ خاموش'' ۱۹۶۸ء، دوسرا مجموعہ ''شورشِ پنہاں'' ۱۹۷۰ء، تیسرا مجموعہ ''شاخ گل'' ۱۹۷۴ء اور آخری مجموعہ ''غزل گلاب'' ۱۹۹۲ء۔ان کے تمام مجموعوں کو لوگوں نے بہت پسند کیا اور ہر ایک نے اپنے اپنے انداز میں دادِ تحسین بھی پیش کیا۔ملاحظہ ہوں ان کے اشعار:

کہیں فریب نہ کھانا یہی فدائے جام
بوقت کار عجب ہوشیار نکلے گا
چمن کا حسن سمجھ کر سمیٹ لائے تھے
کسے خبر تھی کہ ہر پھول خار نکلے گا

کالی داس گپتا رضا اردو کے ان ادیبوں میں سے ہیں جن پر باقی لوگ رشک کرتے ہیں کہ ان کے ہاں اتنی خوبیاں کیسے ہیں۔
شمس الرحمٰن فاروقی اپنے ایک مضمون'' کہتے ہیں اہلِ علم تجھے غائبانہ۔۔'' میں کالی داس گپتا رضا کے متعلق لکھتے ہیں:

''علامہ رضؔا صاحب کی تحقیق کا امتیازی وصف ان کے حقائق اور نتائج کی صحت اور ان کی تلاش و دور رسی تھی۔ہم میں سے اکثر کا کہنا تھا کہ کالی داس گپتا رضا اگر کسی واقعے کی تصدیق کر دیں یا اس کی تاریخ متعین کر دیں تو پھر کسی مزید حوالے کی ضرورت نہیں۔رضؔا صاحب اعلیٰ درجے کے نثر نگار بھی تھے اور انہوں نے بعض شخصی اور سوانحی خاکے بھی خوب لکھے ہیں۔شاعری کے میدان میں وہ محتاط کلاسیکی' زبان و بیان کے معاملوں میں خاص کر وہ کلاسیکی اصولوں کے قائل تھے لیکن روایت کی وہ مردہ چادر کی طرح اوڑھے نہیں رہتے تھے۔''
(سہ ماہی اسباق پونہ، علامہ کالی داس گپتا رضؔا نمبر، جولائی ۲۰۰۱ء سے مارچ ۲۰۰۲ء تک، ص ۱۰)

کالی داس گپتا رضؔا کے فکر و فن پر جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں سے چند کا نام قابل ذکر ہے۔جیسے
۱۔ ''کالی داس گپتا رضا۔تصنیف و تالیف و شعر کی روشنی میں'' از ظفر ادیب' ۲۔''شاعر خوش نما'' از قمر جلال آبادی' ۳۔''ذکر رضا'' (نظم) از عابد باندوی ۴۔''رضا اور غالبیات'' از شین کاف نظام' ۵۔''جہانِ گپتا رضا'' از نذیؔر فتح پوری' ۶۔''متعلقات کالی داس گپتا رضا'' از ساحر شیوی وغیرہ

کالی داس گپتا رضا کے فکر و فن پر جو پی ایچ۔ڈی مقالے لکھے گئے ان میں سے چند کا نام یوں ہیں:
۱۔ کالی داس گپتا رضا: حیات اور کارنامے از ڈاکٹر راہؔی قریشی۔گلبرگہ' ۲۔الی داس گپتا رضا بطور غالبؔ شناس' از عظمت رباب۔گورنمنٹ کالج، لاہور' ۳۔کالی داس گپتا رضا بطور شاعر از نرگس مفتی۔گورنمنٹ کالج، لاہور وغیرہ

مختصر یہ کہ کالی داس گپتا رضا اردو کے ان جاں نثاروں میں سے ہیں کہ جنھوں اپنا اوڑنا بچھونا اردو کے چھاؤں میں ہی رکھا۔اردو ادب کے لیے بیش بہا قیمتی سرمایہ چھوڑ کر ان ادیبوں نے تا دم اپنا نام سنہری حروف میں درج کروایا۔

☆☆☆

نظیر احمد گنائی
ریسرچ اسکالر دہلی یونی ورسٹی
فرصل کلگام کشمیر
فون نمبر: 7889779687

اکیسویں صدی کے چند غیر مسلم ناول نگار

ہندوستان ایک کثیر الجہت ملک ہے جہاں کثیر تعداد میں زبانیں بولی جاتی ہیں۔موجودہ دور میں اگر چہ اردو کو مسلمانوں کی زبان سے منسوب کیا گیا ہے لیکن یہ قطعی صحیح نہیں ہے۔اگر دیکھا جائے تو اردو اور ہندی ایک ہی لسانی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔اردو کی ترقی اور آبیاری کے حوالے سے جہاں مسلم قلمکاروں نے اپنے قلم کی سیاہی سے اس زبان کو وقار بخشا وہیں غیر مسلم قلم کار بھی اس میں برابر کے شریک رہے ہیں۔آپ اس کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ اردو میں نعت گوئی جیسے مقدس موضوع کو نہ صرف مسلم شعراء نے اپنایا بلکہ ہندو شعراء نے بھی اس موضوع کو عقیدت کے ساتھ برتا ہے جو اردو کی کثیر الجہتی کی عمدہ مثالوں میں سے ایک مثال ہے۔جہاں تک اردو ناول میں غیر مسلم ناول نگاروں کی بات ہے تو اس حوالے سے بھی ہمیں بہت سے اہم نام دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، جوگیندر پال، کشمیری لال ذاکر وغیرہ اہم ہیں۔چونکہ اکیسویں صدی کو فکشن کی صدی کہا جاتا ہے اس لیے راقم نے موجودہ صدی کے غیر مسلم ناول نگاروں کے اہم ناولوں کے حوالے سے بات کرے گا۔

کشمیری لال ذاکر (۱۹۱۹ء - ۲۰۱۶ء): کشمیری لال ذاکر وادیٔ کشمیر سے تعلق رکھتے ہیں۔وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے جنھوں نے اردو کی بیشتر اصناف میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے نیز انہیں اردو، ہندی اور پنجابی تینوں زبانوں پر دست رس تھی۔وہ بیک وقت ایک افسانہ نگار، ناول نگار، شاعر، خاکہ نگار اور ایک صحافی کی حیثیت سے اردو ادب میں اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔مختلف موضوعات پر مشتمل ان کی سو سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں کئی افسانوی مجموعے، ناول، ڈرامے، خاکے اور شاعری وغیرہ شامل ہیں۔جہاں تک کشمیری لال ذاکر کی ناول نگاری کا تعلق ہے، انھوں نے اردو ادب کو کئی اہم ناول دیے جن میں ''سندور کی راکھ''، ''سمندر، صلیب اور وہ''، ''انگھوٹھے کا نشان''، ''کرماں والی''، ''دھرتی سدا سہاگن''، ''لمحوں میں بکھری زندگی''، ''ڈوبتے سورج کی کتھا''، ''آدھی رات کا چاند''، ''لال چوک'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔چونکہ کشمیری لال ذاکر وادیٔ کشمیر سے تعلق رکھتے تھے اس لیے ان کے اکثر ناولوں میں وہاں کی دیہاتی زندگی کی جھلکیں صاف دکھائی دیتی ہیں۔انھوں نے اپنے ناولوں میں ایک حساس قلم کار کی طرح تقسیم کے خونی ناچ کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔

جتیندر بلو (۱۹۳۷ء) : اردو میں بہت کم ایسے لکھنے والے ہیں جنہوں نے جس بھی صنف کو ہاتھ لگایا اس میں اپنی انفرادیت قائم کی، جتیندر بلو کا شمار بھی انہی اشخاص میں کیا جا سکتا ہے۔انھوں نے افسانہ اور ناول دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور دونوں میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔جتیندر بلو نے طویل مختصر افسانوں کے علاوہ تین ناول ''پرائی دھرتی اپنے لوگ''، ''مہانگر'' اور ''وشواس گھات'' لکھے ہیں۔ان کے پہلے دو ناول بیسویں صدی میں ہی منظر عام پر آئے ہیں لیکن ان کا تیسرا ناول ۲۰۰۴ میں شائع ہوا جو ہر لحاظ سے ان کے پہلے دو ناولوں سے بہتر ہے۔

نند کشور وکرم (۱۹۲۹ء - ۲۰۱۹ء): چالیس سے زائد کتابوں کے مصنف نند کشور وکرم نے افسانہ نگاری، ناول نگاری اور صحافت نگاری جیسے اصناف کے ذریعے اردو ادب میں اپنی پہچان بنائی۔انھوں نے جہاں اردو افسانے میں اپنا الگ رنگ اختیار کیا وہیں اردو ناول میں بھی اپنے ناولوں کے ذریعے قارئین کو متاثر کیا ہے۔ان کے کل دو ناول شائع ہو چکے ہیں جن میں پہلا ناول ''یادوں کے کھنڈر'' ہے جو ۱۹۶۱ میں شائع ہوا نیز ان کا دوسرا ناول ''انسواں ادھیائے'' ۲۰۰۸ میں شایع ہوا۔اکیسویں صدی کی ناول نگاری کے فروغ میں ان کا ناول ''آخری ادھیائے'' بھی کافی اہمیت رکھتا ہے۔

انل ٹھکر (۱۹۳۴ء - ۲۰۲۰ء): انل ٹھکر ایک ہمہ پہلو شخصیت کے مالک تھے جس بیک وقت ایک ادیب بھی تھے اور ڈراما نگار بھی، افسانہ نگار بھی تھے اور ناول نگار بھی نیز ایک بہترین ہدایت کار بھی تھے اور ایک بہترین مصور بھی۔انھوں نے ناول نگاری کا آغاز ہی اکیسویں صدی میں کیا۔ان کے چھے ناول منظر عام پر آچکے ہیں جن میں اوس کی جھیل (۲۰۰۲)، خوابوں کی بیساکھیاں (۲۰۰۸)، رشتے (۲۰۱۲)، گم شدہ شناخت (۲۰۱۴)، پس اشک (۲۰۱۷) اور گناہِ کبیر (۲۰۱۹) قابل ذکر ہیں۔اوس کی جھیل ہندوستانی معاشرت کے ہر پہلو کا سامنے لاتا ہے۔معاشرتی انحطاط اور سماجی برائیوں کی صاف جھلکیاں اس

ناول میں دکھائی دیتی ہے۔ رشوت، سیاسی سازشیں، مہنگائی، افلاس، سکولوں اور کالجوں میں داخلے کے لیے دھاندلیاں، پرموشن سے لے کر دفتر کی فائل تک سب رشوت کے دلدل میں گرفتار ہیں۔ گویا یہ پورا ناول سماجی حقائق کو تخلیقی انداز میں قاری کے سامنے لانے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس ناول کے بارے میں سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں:

''مجھے خوشی ہے کہ اردو میں ایک اچھے ناول کا اضافہ ہو رہا ہے جو ہماری معاشرت جو''اوس کی جھیل'' بن چکی ہے، کے کئی پہلوؤں کو محیط کرتا ہے۔ ناول دلچسپ ہی نہیں فکر انگیز بھی ہے۔ سلیقہ سے لکھا گیا اور اہتمام سے پیش کیا گیا ہے۔'' (اوس کی رات، ص ۱۲)

آنند لہر (۱۹۵۱ء ۔ ۲۰۱۸ء): آنند لہر پیشے سے وکیل ہیں لیکن وکالت کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے قلم سے ادبی حلقوں میں بھی اپنا نام منوایا۔ وہ ایک افسانہ نگار اور ڈراما نگار کے ساتھ ساتھ ایک منجھے ہوئے ناول نگار بھی ہیں۔ کئی افسانوی مجموعوں کے علاوہ ان کے اب تک پانچ ناول اگلی عید سے پہلے (۱۹۹۸)، سرحدوں کے بیچ (۲۰۰۰)، مجھ سے کچھ کہا ہوتا (۲۰۰۲)، یہی سچ ہے (۲۰۰۸) اور نام دیو (۲۰۱۲) شائع ہو کر داد حاصل کر چکے ہیں۔ آنند لہر اپنے افسانوں اور ناولوں میں ملک کے سرحدوں پر جنگ ختم کرنے، انسانی قدروں کو فروغ دینے اور انسانیت اور بھائی چارگی کو بڑھاوا دینے پر زور دیتے ہیں کیونکہ صوبہ جموں سے تعلق رکھنے کے سبب انہیں سرحد کے انتشار انگیز حالات کا بخوبی علم ہے۔ ناول ''سرحدوں کے بیچ'' میں انھوں نے اسی انتشار انگیز ماحول کو پیش کیا ہے نیز اس ناول میں انھوں نے ہندوستان کی تقسیم اور سرحدوں کے دونوں جانب رہنے والے لوگوں کے مسائل کا خلاصہ بھی پیش کیا ہے۔ دوسرے ناولوں سے قطع نظر ان کا اہم ناول ''نام دیو' اپنے علامتی اسلوب کے سبب ادبی حلقوں میں اپنی اہمیت قائم کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ ناول میں انھوں نے علامتوں کے استعمال سے انسانی زندگی اور جنسی نفسیات کے سلسلے میں خاص فضا تیار کی ہے۔

رینو بہل (۱۹۵۸ء): رینو بہل کا ناول ''میرے ہونے میں کیا بُرائی ہے'' ۲۰۱۷ میں منظر عام پر آیا۔ یہ ناول اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک انفراد کا پتہ دیتا ہے۔ جو اپنی نوعیت کا شاید پہلا ایسا ناول ہے جس میں Thansgender (خواجہ سراؤں) کی زندگی کے متنوع مسائل کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح یہ ناول موجودہ سماجی صورتحال کی ترجمانی میں ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔

آشا پربھات: ''دھند میں اُگا پیڑ'' کے بعد آشا پربھات کا ایک اور ناول ''جانے کتنے موڑ'' ۲۰۰۹ میں منظر عام پر آیا۔ اس ناول میں عورتوں کے ساتھ ہو رہے مظالم کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول کا موضوع مرکزی کردار ''لتا'' کے ارد گرد گھومتا ہے۔ جس میں اس کی دو زندگیوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مذکورہ ناول میں بھی عورت قدیم رسوم و روایات کی پاسداری کے لیے مجبور نظر آتی ہے۔ ناول میں اس بات کا تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ ''لتا'' کی طرح تہذیبی پاسداری کے جبر میں تقریباً ہر عورت اپنے ارمانوں کا قتل کرتی ہے۔ خواہشات کو کچل دیتی ہے اور اپنے جذبات کا جنازہ نکالنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

اس کے علاوہ اکیسویں صدی کے غیر مسلم ناول نگاروں میں بلراج ورما' شب تار (۲۰۰۲)'، 'گوتم (۲۰۰۴)' اور رتن سنگھ' سانسوں کا سنگیت' وغیرہ قابل ذکر ہیں جو اردو ناول نگاری کو وسعت دینے میں ہنوز اپنا زور قلم صرف کر رہے ہیں۔ الغرض یہ کہ مسلم ناول نگاروں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم ناول نگار بھی اکیسویں صدی کو فکشن کی صدی بنانے میں ایک اہم کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

ساحل مدثر

ریسرچ اسکالر' یونی ورسٹی آف حیدرآباد

گچی باؤلی' حیدرآباد۔500046 (تلنگانہ)

اردو صحافت میں گربچن چندن کی خدمات

مشہور صحافی جی ڈی چندن (۲۰۱۵-۱۹۲۲) کا اردو صحافت میں ایک اہم نام ہے وہ صرف ایک صحافی ہی نہیں بلکہ اردو صحافت کی خامیوں اور خوبیوں پر گہری نظر رکھا کرتے تھے اور ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ اردو صحافت کو کیسے ترقی دی جائے تا کہ وہ ہم عصر صحافت کا مقابلہ کر سکے، اردو اخبارات میں اشتہارات کا سلسلہ شروع کرانے میں بھی جی ڈی چندن کا بہت بڑا ہاتھ ہے اور انہوں نے مختلف وزارتوں میں اس سلسلے میں کوششیں کی، یو این آئی اردو سروس کے ذریعہ اردو میں دنیا کی پہلی ٹیلی پرنٹر کی سروس شروع کرانے میں جی ڈی چندن کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے اس حوالے سے کئی میٹنگیں کی تھیں جس کے بعد یہ سروس شروع ہوسکی تھی، وہ پی آئی بی میں اردو آفیسر کے عہدے پر فائز تھے لہٰذا پورے ملک کے اردو اخباروں اور صحافیوں سے ان کا رابطہ تھا۔ دہلی و بیرون دہلی کے بہت سے ایڈیٹر اپنے کام اور اپنی ضرورتوں کے تحت ان کے دفتر میں ان سے ملتے تھے، جس کی وجہ سے ہندوستان بھر سے نکلنے والے اردو اخباروں کے بارے میں ان کی معلومات وسیع ہوتی گئیں جو آگے چل کر ان کے بہت کام آئیں، پی آئی بی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے آر این آئی کی سالانہ رپورٹوں تک رسائی ان کے لیے بہت آسان تھی، وہ ہر سال کی رپورٹ کا مطالعہ کرتے اور اس کی روشنی میں رپورٹ اور مضامین تیار کرتے جو سند کا درجہ رکھتے۔ ان کی یادداشت بہت تیز تھی۔ ایک بار جو چیز پڑھ لیتے وہ ہمیشہ کے لیے ان کے ذہن میں بیٹھ جاتی۔ اردو صحافت کی ابتدا اور اس کے ارتقا پر وہ ایک اتھارٹی سمجھے جاتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ وہ ایک ایسے صحافی تھے جو صحافت کی تاریخ کی چلتی پھرتی لائبریری تھے۔ ان کی رائے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کی تصنیفات جو اردو صحافت پر مبنی ہیں اردو صحافت کی ایسی دستاویز ہیں کہ جن سے عہد حاضر کے ہر اُس محقق کو واسطہ پڑتا ہے جس کا ذرا سا تعلق بھی اردو صحافت کے ساتھ ہو۔ جی ڈی چندن نے اپنی کتاب میں جب دہلی اردو اخبار کے مالک و ایڈیٹر مولوی محمد باقر کی شہادت کے بارے میں جو کچھ لکھا اسے پوری صحافتی دنیا نے قبول کیا، ان کی کتاب ''جام جہاں نما'' کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی، آٹھ ابواب پر مشتمل اس کتاب کے عنوانات یوں ہیں۔

اردو کا سب سے پہلا اخبار، پس منظر، ہری ہر دت اور سدا سکھ لعل، جام جہاں نما پر چیف سکریٹری ڈبلیو بی بیلی کا تبصرہ، خبروں کے نمونے، حکومت سے تعلقات، اخبار کا نیا دور اور اردو صحافت کا نقش اول۔ ۲۴۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں جہاں اردو کے پہلے اخبار کا بھرپور تعارف پیش کیا گیا ہے۔ وہیں اس سے قبل کی صحافت کی مختلف شکلوں کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

۱۹۸۶ء میں ان کی پہلی کتاب ''اردو صحافت پر ایک نظر'' سے اس اردو زبان کے سماج میں ایک سنسنی پیدا ہوگئی تھی کیونکہ اس میں پہلی بار یہ بتایا گیا کہ پورے ملک میں اردو زبان میں کتنے اخبار نکلتے ہیں اور مختلف ریاستوں میں ان کی تعداد اور حیثیت کیا ہے۔ یہ کتاب ''اردو صحافت کا سفر'' بہت معلوماتی ہے۔ ۳۸۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں جام جہاں نما، الہلال، مولوی محمد باقر، تحریک آزادی میں اردو صحافت کا حصہ سمیت کئی مضامین شامل ہیں۔ برطانیہ میں پاکستان کی اردو صحافت پر بھی ایک بے حد

عمدہ مضمون ہے جو برصغیر ہندو پاک سے باہر اردو صحافت کا جائزہ پیش کرتا ہے۔ان کی دوسری کتابوں میں اردو صحافت پر ایک نظر، اردو صحافت کی ابتدا اور جمنا داس اختر، شخصیت اور ادبی وصحافتی خدمات قابل ذکر ہیں۔آخر الذکر کتاب مکتبہ جامعہ نئی دہلی کے رسالہ ''کتاب نما'' کا خصوصی شمارہ ہے، صحافت کے موضوع پر ان کے مضامین اکثر و بیشتر اخباروں کی زینت بنتے رہے ہیں۔

وہ ہندو مسلم بھائی چارہ کے ایک جیتے جاگتے ثبوت تھے ،اور سیکولر ذہن کے مالک تھے، اگر چہ وہ ہندوستان میں مہاجر کی حیثیت سے آئے تھے لیکن ان کے دل و دماغ تعصب سے یکسر پاک تھے، اہم اور سرکردہ مسلم شخصیات اور مسلم صحافیوں سے ان کے بڑے گہرے مراسم تھے، جس طرح لوگ ان کی قدر کرتے اسی طرح وہ بھی دوسروں کی قدر کرتے تھے۔

سہیل انجم لکھتے ہیں کہ:

''ان کے دوست احباب اور بے تکلف ملاقاتی ان کو چندن صاحب کہا کرتے تھے، جس طرح چندن کی لکڑی بہت قیمتی ہوتی ہے اسی طرح چندن صاحب کی ذات بھی اردو صحافت کے تعلق سے بہت اہم تھی، انھوں نے اگر چہ کسی بڑے اخبار کے دفتر میں زیادہ کام نہیں کیا تھا تاہم اردو صحافت کی تاریخ کا جتنا علم ان کو تھا ہندوستان اور پاکستان میں شائد ہی کسی اور کو ہو، ان کی تصنیفات بے حد مقبول ہیں جنھیں حوالوں کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ 8 اکتوبر 1922 کو لاہور کے باغباں پورا گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔انھوں نے تقسیم سے قبل لاہور کے انگریزی روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے اور روزنامہ ساگر لاہور میں ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دی تھیں۔انھوں نے اپنے آبائی وطن باغباں پورہ سے منسوب کرتے ہوئے "باغباں پورہ کی آواز" نامی ایک ہفت روزہ اخبار بھی جاری کیا تھا جو جلد ہی بند ہو گیا، ان اخباروں سے ان کی وابستگی زیادہ عرصے تک نہیں رہی، ۱۹۴۷ میں وہ ہجرت کر کے ہندوستان آگئے۔اس وقت دہلی سے ایک ہفت روزہ اخبار ''نیشنل کانگریس'' نکلتا تھا، انھوں نے اس کی ادارت کی ذمہ داری سنبھال لی، لیکن کسی اچھی ملازمت کی تلاش جاری رکھی، جو بالآخر پوری ہوئی، انھیں 1948 میں حکومت ہند کے ایک باوقار ادارے پریس انفارمیشن بیورو (پی آئی بی) میں ملازمت مل گئی جہاں وہ اردو آفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے، وہ اگست 1980 میں پی آئی بی کے شعبہ اردو کے چیف کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد ایک عرصے تک حیدرآباد کے معروف اخبار "منصف" کے دہلی میں نمائندے رہے''

آجکل کے اردو صحافت نمبر میں اپنے ایک تحقیقی مضمون اردو صحافت 1940ء میں برطانوی عہد کی اردو صحافت کے کوائف اور سرکولیشن کے حقائق شائع ہوا تھا، یہ مضمون برٹش حکومت کی ایک خفیہ پولیس رپورٹ پر مبنی تھا۔

آزادی کے اولین قریب تین دہائیوں میں اردو اخباروں کی تعداد تین گنا سے بھی زیادہ بڑھ کر 1982 میں 1330 ہو گئی تھی۔اس کتاب میں یہ بھی بتایا گیا کہ مختلف نامور اخباروں کا سرکولیشن کیا ہے، یہ ایک ایسا پہلو ہے جسے ہمارے ناشر بڑیا ہتمام سے صیغہ راز میں رکھتے ہیں اور سینہ بہ سینہ اس کے افسانے سناتے رہتے ہیں۔ 1986ء سے قبل کسی زمانے میں ایسے اعداد باضابطہ پیش نہیں کیے گئے تھے بلکہ عام طور پر اردو صحافت کو جذبات اور ایک دو اشخاص کے ناموں کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔

جی، ڈی، چندن کی اردو زبان کی ترویج اور اردو

مضامین

صحافت کے رول کو اجاگر کرنے کے حوالے سے خدمات بے مثال ہیں، انہیں آج اردو صحافت کی ایک اہم کڑی تسلیم کیا جاتا ہے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان میں بھی صحافت کے موضوع پر ان کو یہ مقام حاصل ہے۔ کراچی یونیورسٹی نے انہیں صحافت کے موضوع پر پی ایچ ڈی کرنے والے طلباء کا ممتحن مقرر کیا۔

ڈاکٹر طاہر مسعود نے اپنی 1284 صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب ''اردو صحافت انیسویں صدی میں'' میں چندن صاحب کی کتاب ''جام جہان نما'' اور ''اردو صحافت کا سفر'' کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب کے پیش لفظ میں بھی کیا ہے، اور گربچن چندن کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''میں جناب گر بین چندان کا ممنون ہوں کہ ان کی تحقیق نے مجھے یہ کتاب لکھنے میں بڑی مدد کی، یہ دلچسپ انکشاف بھی چندن صاحب کی محنت شاقہ کا ثمرہ ہے کہ اردو دنیا کی پہلی زبان ہے جس میں انگریزی سے پہلے اخبار (Newspaper) کا لفظ اور تصور آیا، اردو صحافت کے بارے میں کتاب لکھنے کا خیال 1975ء میں اس وقت آیا جب انھیں وزارت اطلاعات ونشریات کے ماس کمیولیشن انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی طرف سے لکھنؤ میں اردو مدیران کے ایک کل ہند سینار اور ورک شاپ کا انعقاد کرنے کے لیے کہا گیا، ایمرجنسی کے نفاذ کے دوران یہ خیال مزید تقویت اختیار کر گیا، ایمرجنسی بہت سوں کے لیے سیاسی جبر و استبداد کا سبب بن گئی تھی لیکن ان کی زندگی کے لیے یہ مرحلہ ایک نیا موڑ ثابت ہوا، میں نے اس کی سیاسی نوعیت سے ماوراء اسے ایک نفسیاتی مرحلے کے طور پر محسوس کیا اور اسے یہ فکر یہ باور کیا۔''

جی، ڈی، چندن ہمیشہ اردو صحافت کی آبیاری کے لئے فکر مند رہتے تھے، جب سروپکمیشن کے قیام کا اعلان کیا گیا، ان کی خواہش اور دعا تھی کہ کمیشن اس مرتبہ اردو پریس کا بھی جائزہ لے، ان کی مراد اس وقت بر آئی جب ان کے انفارمیشن آفیسر مسٹر بی ایس بھارگو نے ان کو ہدایت دی کہ وہ اردو پریس کے مطالعہ کے بارے میں کمیشن کی مدد کریں، اس طرح پہلی مرتبہ پر میں کمیشن کے سامنے اردو پریس کے موقف و مسائل پر ایک مبسوط رپورٹ آئی، 50 صفحات پر مشتمل اس رپورٹ میں چندن صاحب نے 1955 سے لے کر 1980 تک کے عرصہ کا احاطہ کیا، اس رپورٹ کو دوسرے کمیشن کی رپورٹ میں خصوصی ضمیمہ کے طور پر شامل کیا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جی ڈی چندن کی کاوش اور محنت کے نتیجے میں پریس کمیشن کے سامنے اردو صحافت کا نقشہ اعداد وشمار کے حوالے سے پہلی مرتبہ پیش ہوا، یہ مضمون ایک حوالہ کی حیثیت رکھتا ہے، مزید برآں وزارت اطلاعات ونشریات کے زیراہتمام شائع کتاب ''ماس میڈیا ان انڈیا ۲۰۰۴ میں بھی اردو پریس ان انڈیا'' کے عنوان سے چندان صاحب کا مبسوط انگریزی مضمون شامل کیا گیا ہے جو اہل علم اور اسکالر حضرات کے لیے ایک حوالہ جاتی کتاب کی حیثیت رکھتا ہے

☆☆☆

رباعی

وہ قافلہ کیا؟ اُس کی قیادت ہی کیا
جب لوٹ لے سردار حفاظت ہی کیا
گر باڑھ ہی چرنے لگے کھیتوں کی فصل
کھیتوں کے لئے باڑھ کی حاجت ہی کیا

ٹھاکور دامودھر ذکی

راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ بحیثیت شاعر

اردو ادب کی تاریخ اگر ہم پڑھیں تو بہت سے ایسے شعراء ہیں جنہوں نے تاریخ کے پنّوں پر اپنے خوبصورت نشان چھوڑے ہیں اور اُردو شاعری کو درجہ کمال تک پہنچایا۔ نہ صرف مسلم شعراء بلکہ غیر مسلم شعراء کی بھی ایک ایسی فہرست ہے۔ جنھوں نے اردو شاعری کو پروان چڑھایا۔ ایسے ہی ایک شاعر راجہ گردھاری پرشاد باقی (بنسی راجہ) تھے۔ جن کا تعلق حیدرآباد دکن سے تھا اور وہ کائستھ گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ راجہ گردھاری پرشاد باقی نے جس زمانے میں نشو نما پائی اور جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ نواب میر محبوب علی خان کا زمانہ تھا۔ باقی فارسی کے بہترین شاعر تھے۔ چونکہ اس وقت فارسی کی روایت چلی آرہی تھی اس لیے باقی نے روایت کے مطابق فارسی زبان میں تعلیم حاصل کی اور فارسی کے ماہر بن گئے۔ فارسی زبان کے علاوہ وہ اردو پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ باقی فارسی کے عمدہ سخن ور تھے تو وہیں اردو کے صف اول کے شاعر تھے۔

راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ ایک علم دوست شاعر، ملی جلی تہذیب اور ہندو مسلم اتحاد کا ایک بہترین نمونہ تھے۔ جہاں ہندو مذہب کے پابند تھے وہیں تصوف سے خاص لگاؤ تھا اور تمام مذاہب کا احترام کرتے تھے۔ انہوں نے حیدرآباد کی تہذیب' شادی بیاہ کے رسومات اور ساتھ ہی مختلف مذاہب کے تہواروں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

باقیؔ شاعری میں شمس الدین فیض سے اصلاح لیا کرتے تھے اور خود کو ان کا شاگرد مانا کرتے تھے۔ باقی نے شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی قصائد، نعت، منقبت اور سلام، رباعیات، قطعات وغیرہ۔ باقی نے فارسی اور اردو کے علاوہ ہندی میں بھی اشعار کہے۔ باقی نے خود کو فیض کا شاگرد کہا جس کا اعتراف انھوں نے اپنی غزلیات میں بھی کیا ہے۔

حضرت فیض کا سب ہے باقی پہلے
یہ سخن گوئی تھی ایسی نہ زبان دانی

وہ فیضؔ کے سوا اور کلام کی حد تک کسی اور کے شاگرد خود کو نہیں سمجھتے تھے۔ فارسی میں باقی کے استاد محمد علی عاشق تھے۔ بحیثیت شاعر باقی کا جو مرتبہ رہا اس کو ان کے ہم عصر شعراء نے یوں بیان کیا ہے۔

خوش سیر، خوش وضع، خوش تقریر، خوش خو، خوش نصیب
خوش کلام، خوش مقال، و خوش خصال و خوش بیان

باقیؔ کا دورِ شاعری وہ ہے جب کہ دبستان لکھنو عروج پر تھا اور دبستان دہلی بکھر چکا تھا۔ باقی نے ایک عالم کی حیثیت سے لکھنو اور دہلی دبستانوں کے اساتذہ کے کلام کا بخوبی مطالعہ کیا۔ باقی کے کلام کی سب سے اچھی خوبی حسن ادا، شایستگی تھی۔ باقی نے سلام بھی کہے تھے۔ ان کے سلام میں خیالات کا اظہار' طرزِ ادا کا حسن' زبان کی سلاست یہ سب چیزیں ہیں جس نے ان کے سلاموں کا مرتبہ بلند کیا۔ باقی نے فارسی میں نعت بھی کہی۔ باقیؔ نے اپنے دیوان ''بقائے باقی'' میں جو غزلیات لکھی ہیں اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کلام کا بیان لطیف اور دلچسپ ہے۔

باقیؔ کی شاعری کی انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی جو زبان ہے وہ پُر لطف ہے اور ان کی شاعری کی زبان دوسرے

شعراء کی زبان سے مختلف ہے۔ باقی ہر بات کو بغیر کسی الجھاؤ کے صاف صاف بیان کردیتے ہیں۔ سادگی، صفائی، انداز بیان، لطافت اور سلاست، ان کی انفرادیت ہے۔ باقیؔ خود اپنی زبان پر ناز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

شاگرد ہو جو باقیؔ
استاد شاعراں کے
ثانی تمہارا کوئی باقی
نہیں دکن میں

باقیؔ کی شاعری کے موضوعات دوسرے شعراء کے موضوعات کی طرح ملتے جلتے ہیں. جیسے کہ محبوب کا سراپا، محبت اور زندگی اس کی بے اعتنائی، زلفوں کا بیان، ان کے غزلوں میں پایا جاتا ہے۔ ان کا کلام جذبات سے بھرپور ہے۔ تشبیہات ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔ محبت اور محبوب کی بے اعتنائی کے متعلق باقیؔ لکھتے ہیں کہ:

بس آتے ہی اب روٹھ کے جانا نہیں اچھا
جانا نہیں اچھا ہے جانا نہیں اچھا مجھے بد
اچھا نہیں میں تم نے جو جانا نہیں اچھا

ایک شاعر کا کمال دراصل یہی ہوتا ہے کہ وہ کس طرح اپنے کلام کو لطف اندوز بنائے۔ باقیؔ کے کلام کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کا لطافت بیان کس قدر دلچسپ ہے۔

باقیؔ گرچہ اردو سے زیادہ فارسی کی طرف مائل تھے۔ ان کا نظم ونثر کا سرمایہ فارسی ہی میں ہے۔ نثر اور نظم کی جملہ 31 کتابیں باقیؔ نے لکھیں۔

باقیؔ کی شاعری کے متعلق پون کماری رقمطراز ہیں:

''باقیؔ شاعری میں محاورے اس خوبصورتی اور برجستگی کے ساتھ برتتے ہیں جیسے کوئی دہلوی الاصل شاعر برتتا ہے۔ ان کا اسلوب بیان بھی ان کی زبان کی طرح سادہ ہے۔ مگر جہاں تک مضمون آفرینی کا تعلق ہے ان کے یہاں وہی گنگا جمنی طرز فکر ملتا ہے۔ انہوں نے دونوں دبستانوں کی شعری روایت سے استفادہ کیا ہے۔ چناں چہ ایک شعر میں وہ میر کی پیروی کا ذکر کرتے ہیں:

جناب میر کا پیرو ہوں باقیؔ
مرے شعر و سخن میں کیا اثر ہے

(ایضاً: راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ اور ان کے خاندان کی اردو خدمات از پون کماری۔ ص نمبر 111)

باقیؔ کی شاعری پڑھ کر یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ باقیؔ نے فطرتاً ایک شاعر کا دل پایا ہے۔ باقیؔ کے کلام میں بعض جگہ حضرت داغؔ کا رنگ نمایاں ہے۔ اپنے نعتیہ کلام میں انہوں نے جس عقیدت سے الفاظ کا جامعہ پہنایا ہے کسی بھی خیال کو اشعار میں بڑی خوش اسلوبی اور انوکھے پن سے ادا کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں ملتے ہیں۔ سلاست اور برجستگی باقیؔ کے کلام کے اہم اجزاء ہیں۔

باقیؔ نے سلام بھی لکھے ہیں۔ سلام مرثیہ کے بہ نسبت زیادہ صاف، سلیس اور سادہ ہوتا ہے۔ باقی نے بہت سے سلام لکھے ہیں۔ خیالات کا تنوع، حسن زبان کی سلاست اور الفاظ کا برمحل استعمال ان کے سلاموں کا مرتبہ بلند کرتا ہے۔

باقیؔ کی شاعری میں صداقت اور خلوص جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں حد سے زیادہ دلکشی خلوص اور صداقت واضع طور پر نظر آتا ہے۔ بقول ڈاکٹر بھاسکر راج سکینہ:

''باقیؔ کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک طرف وہ اپنے پروردگار اور اس کی ساری کائنات سے بے پناہ عقیدت اور

مضامین

محبت رکھتے ہیں تو دوسری جانب اپنے ماحول سے بے بہرہ نہیں انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی معاشرت یو کہہ کہ ہندوستان کی تہذیبی و دنیوی رجحانات کا مطالعہ کیا۔ اور پھر اس سماج کے نمائندہ بن کر اپنے شعر وسخن میں اس کی نمائندگی کی''۔(بھاسکر راج سکسینہ، حیدرآباد کے بنسی راجہ، اسپیڈ پرنٹس حیدرآباد، صفحہ نمبر ۲۲)

ان کا دیوان ''بقائے باقی'' 92 غزلوں ایک مخمس اور 16 ثلاثوں پر مشتمل ہے۔

دل میں دنیا کا تماشا دیکھا
موجزن کوزے میں دربار دیکھا

باؔقی کی شاعری کے مطالعے کے بعد راقم کو محسوس ہوا کہ باؔقی کو ہم ایک بہترین غزل گو شاعر کہہ سکتے ہیں چونکہ غزل ویسے واردات عشق ومحبت کی شاعری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آج کل غزل میں زمینی موضوعات بھی شامل ہیں۔شاعر کی غزل میں عشق ومحبت کے حقیقی جذبات کا عکس کم ملتا ہے۔ باقی کی غزلوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا دل درد آشنا تھا اور وہ عشق کی لذت والم سے واقف تھے۔ان کی غزلوں میں ایسے اشعار ملتے ہیں جنھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ صرف رسمی شاعری نہیں بلکہ ان اشعار کے پیچھے حقیقی اور شدید تاثرات موجود ہیں۔ بقائے باقی کے آخر میں 17 سلام بھی شامل ہیں۔سلام شکل اور ساخت کے لحاظ سے غزل سے مشابہت رکھتا ہے اور مرثیہ کی بہ نسبت زیادہ صاف اور سلیس ہوتا ہے۔ان کے سلام میں خیالات کا تنوع بھی ہے اور طرز ادا کا حسن بھی ہے۔

''درد باقی وورد ساقی'' کے نام سے ان کی ایک اور اردو تصنیف کا ذکر کیا ہے. جو خواجہ درد کی تقریباً دو سو فارسی رباعیات کا اردو رباعیوں میں ترجے پر مشتمل ہے۔اس کتاب کے آخر میں خود باقی نے بھی اپنی سوا سو فارسی اور چار اردو رباعیاں شامل کی تھیں۔درد کی رباعیاں تصوف سے مالا مال ہیں۔ یہ رنگ باؔقی کے مزاج سے مناسبت رکھتا تھا۔اس لئے انھوں نے درد کا اتنا اثر قبول کیا کہ خود ان کی فارسی رباعیاں بھی درد کی رباعیوں کا نقش بن گئیں۔

سب سمجھتے اور ہیں حالت ہماری اور ہے
اور بیماری ہے کچھ بیمار داری اور ہے

☆☆☆

نیہا نورین نوؔر
ریسرچ اسکالر، یونیورسٹی آف حیدرآباد
nehanoor994@gmail.com

وصایا مولانا رومیؒ

☆ میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کھلے اور چھپے خدا سے ڈرنے کی۔
☆ کھانے، سونے، بولنے میں کمی کرو۔
☆ گناہوں سے دور رہو!۔
☆ شہوتوں کو ترک کرو!
☆ قیام شب اور روزوں کا اہتمام کرو!
☆ ہر طرح کے انسانوں کی جفاؤں کو برداشت کرو!
☆ نیکوں، بزرگوں کی صحبت اختیار کرو!
☆ بہترین کلام وہ ہے جو مختصر اور دلیل والا ہو۔
☆ بہترین آدمی وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہنچائے۔
☆ تمام تعریف وتوصیف خدائے واحد کے لئے ہے۔اور اس کے پیغمبر ﷺ پر سلام ہو۔!!

oOo

مالک رام بحیثیت محقق۔ایک جائزہ

اُردو تحقیق میں مالک رام کا نام ایک درخشندہ ستارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ان کا تذکرہ کئے بغیر اردو تحقیق کی روایت ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی۔تحقیق کو فروغ دینے اور اسے مستقل موضوع کی حیثیت عطا کرنے والوں میں مالک رام کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔انہیں تحقیق کے طریقہ کار سے حقیقی مناسبت اور دلچسپی تھی۔انہوں نے تحقیق کو ایک نئی سمت عطا کی۔ان کی تصنیفات و تالیفات میں بڑا تنوع ہے۔ وہ ایک قدآور محقق اور کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔

مالک رام کی تصنیفات و تالیفات اور مختلف مضامین اتنے وسیع تعداد میں ہیں کہ ان کے جیسا کوئی ملازم پیشہ شخص تو کیا بلکہ ہمہ وقت تصنیف و تالیف کرنے والا ادیب بھی مشکل ہی سے لکھ سکے گا۔انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ان کے مزاج میں کھوج و تلاش کا بڑا مادہ تھا۔تحقیق جیسے دشوار،خشک اور پر خار راہ میں وہی شخص دل جمعی سے کام کرسکتا ہے جسے تحقیق سے مناسب اور بے انتہا لگاؤ ہو اور وہ تخلیقی ذہن کا مالک ہو۔مالک رام کو ابتدا سے ہی تحقیق سے خاصی دلچسپی تھی ان کے نزدیک طلب کا دوسرا نام تحقیق ہے۔ان کی تخلیقی صلاحیت کے حوالے سے ڈاکٹر محمد علی صدیقی لکھتے ہیں:

''وہ اردو کے ہم عصر محققین میں سب سے زیادہ تخلیقی ذہن کے مالک تھے''

(مالک رام حیات اور ادبی خدمات ،محمد ارشد،علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ،۲۰۰۲،ص۔۷)

مالک رام ایک تخلیقی ذہن کے مالک تھے ان کا مزاج خالص علمی تھا۔انہیں تحقیقی اصولوں پر عبور اور اس کے تدریجی ارتقاء پر گہری نظر تھی۔انہوں نے تحقیق کو نئے اسلوب و اہنگ سے آشنا کیا۔اپنی تحقیقی معلومات پر وہ آسانی سے مطمئن نہیں ہوتے بلکہ مختلف حوالوں سے موازنہ کرتے اور غور وفکر و استدلال کے بعد کسی نتیجے پر پہنچتے تھے۔تحقیق کے ان ہی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے غالبیات سے متعلق سوانحی و متنی تحقیق کے اعلیٰ نمونے پیش کیے۔پروفیسر آل احمد سرور نے خطوط غالب کے دیباچے میں مالک رام کی تحقیقی خوبیوں کو سراہتے ہوئے لکھا ہے:

''اردو کے محققوں میں مالک رام کئی حیثیتوں سے امتیاز رکھتے ہیں۔وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے ہر پہلو کا غائر مطالعہ کرتے ہوئے تمام ضروری مواد مہیا کرتے ہیں اور نہایت سلجھے شگفتہ انداز میں مواد پیش کرتے ہیں۔ان کے یہاں جذباتیت سرے سے نہیں بلکہ ہمدردی کے باوجود ایک معروضی نظر کی کوشش ہے۔''

(مالک رام ایک بڑی علمی و ادبی شخصیت،ڈاکٹر محمد علی صدیقی،مشمولہ،اشاعت۱۹۹۴ء ص۔۷۲)

مذکورہ حوالے سے اس بات کا واضح اشارہ ملتا ہے کہ مالک رام جذباتی انداز میں کوئی فیصلہ نہیں کرتے بلکہ موضوع کے ہر پہلو پر غور وفکر کر کے اپنے نتائج پیش کرتے ہوئے اہم اور غیر اہم میں تمیز کرتے تھے۔انہوں نے تدوینی میدان میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں جن میں

تصانیف آزاد کی ترتیب و تدوین کافی اہمیت رکھتی ہے۔اس کام میں ان کی اعلی قابلیت،عربی زبان و اسلامیات سے واقفیت اور تحقیقی شعور نے مطالعہ آزاد کو نہ صرف آسان بنایا کیا بلکہ اس کی افادیت بھی بڑھادی۔ مالک رام کے تدوینی کاموں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے بحیثیت مدون وہ ایک اہم مقام پر فائز ہیں۔ مالک رام تاریخ کے ایک اچھے عالم ہیں۔ انہیں تاریخ سے خصوصی دلچسپی تھی۔ اسلامیات کے بعض مضامین میں تاریخی واقعات پر بحث ملتی ہے۔

تنقید کے بغیر تحقیق میں کامیابی حاصل کرنا دشوار ہے۔ ہر بڑا محقق کی اپنے تحقیقی نظریات تنقید کی کسوٹی پر کس کر پیش کرتا ہے۔ مالک رام اردو کے ایک ایسے محقق ہیں جن کی تحریروں میں جا بجا تنقیدی اشارے ملتے ہیں۔تنقید سے متعلق انہوں نے مستقل تصنیف نہیں چھوڑی لیکن تنقیدی مضامین برابر لکھتے رہے۔ان کے نزدیک تنقیدی کام کا جائزہ لینا تخلیقی عمل کو آگے بڑھانا ہے۔ مالک رام کی تحقیقی وتنقیدی بصیرت کے حوالے سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

''مالک رام نے تنقید کو اس طرح اپنا موضوع خاص نہیں بنایا جس طرح تحقیق کو، چونکہ تحقیق و تنقید کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔اس لئے تنقیدی اشارے مالک رام کی تحقیق میں جا بجا نظر آتے ہیں۔جن سے صرف ان کی تنقیدی بصیرت کا ہی پتہ نہیں چلتا بلکہ یہ تنقیدی بصیرت قاری کے دل پر اپنا مستقل نقش بٹھاتی چلتی ہے۔''

(مالک رام صاحب کی زندگی کے آخری ایام، ایم حبیب خان، اپریل ۱۹۹۴ء، ص۔۱۰۷)

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی رائے سے واضح ہوتا ہے کہ مالک رام کی تحریروں میں تنقیدی اشارے ملتے ہیں اور جو قاری کو متاثر کرتے ہیں۔تحقیق کی طرح اگر وہ تنقید پر خصوصی توجہ کرتے تو یقیناً وہ ایک بڑے نقاد ہوتے مگر ان کی اعلی تنقیدی بصیرت کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مالک رام ایک اہم نقاد ہیں۔

خاکہ نگاری اور مرقع نگاری میں بھی مالک رام نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے اس سلسلے میں وہ ''صورتیں الہٰی'' ان کے ذریعے لکھے گئے دس خاکوں کا مجموعہ ہے۔ یہ خاکے فنکاری کے بہترین نمونے ہیں۔انداز نگارش اور زبان و بیان نہایت دلکش ہے۔ مالک رام نے تخیل کے سہارے غالبؔ کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ اردو ادب میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ مذکورہ خاکے کے مطالعے سے قاری غالب کی زندگی سے واقف ہو جاتا ہے۔ اس مجموعے کے علاوہ انہوں نے اور بھی کئی خاکے لکھے ہیں۔

مالک رام نے اردو ادب میں بہت ساری خدمات انجام دیں اور ان میں سب سے اہم خدمت اردو تحقیق کو فروغ دینا، اسے نئے اسلوب و آہنگ سے آشنا کرنا، نئی سمت عطا کرنا اور تحقیق کو تصنیف کا رتبہ عطا کرنا ہے۔مختصر یہ کہ اردو ادب میں ان کی بلند پایہ خدمات حوالے کا درجہ رکھتی ہیں۔

☆☆☆

رمیض سلطان پوری
ریسرچ اسکالر، دہلی یونی ورسٹی
موبائل: 8492844990

جوگیندر پال کی افسانوی کائنات

اُردو فکشن کی ایک نوزائیدہ اور جدید صنف ''افسانچہ'' ہے۔افسانچہ، کہانی کی مختصر ترین اور جدید ترین صورت ہے۔اسے ''منی افسانہ'' اور ''منی کہانی'' بھی کہتے ہیں۔ یہ قصہ کی ایک نئی صورت ہے۔افسانچہ دراصل افسانہ کی ہیئت میں تبدیلی کا تجربہ ہے۔جس طرح ناول سے ''ناولٹ'' نکلا اسی طرح افسانے کے بطن سے افسانچہ نے جنم لیا۔آج تک اس کی کوئی جامع تعریف متعین نہیں ہوسکی ہے۔اُردو کے ممتاز افسانہ نگار پروفیسر بیگ احساس نے افسانچہ کی تعریف اور فن کے لیے چند عناصر اور شرائط کا ہونا ضروری قرار دیا اور افسانچہ کے اجزائے ترکیبی کے بارے میں اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' منی افسانہ۔۔۔میں تخلیقیت پہلی شرط ہونی چاہیے۔دوسرے منی افسانہ ایک تکمیلیت کا احساس دے۔منی افسانے کا اختتام پر کوئی تاثر ابھر کر سامنے آئے۔۔۔۔منی افسانہ نگار کو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ موضوع طاقتور ہو، پیش کش اور اختتام موثر ہو، اور اس چھوٹی صنف میں کہیں نہ کہیں نقطہ عروج بھی ہو۔منی افسانے میں کسی ماجرا کا ہونا بے حد ضروری ہے۔'' (اُردو میں منی افسانہ، آمنہ آفرین۔ص۔۸)

جوگیندر پال اردو کے صف اوّل کے افسانہ نگار ہیں۔ وہ ۵/ستمبر ۱۹۲۵ء کو سیالکوٹ کے ایک گاؤں ''چاوناں'' میں پیدا ہوئے اور بی۔اے تک کی تعلیم وہیں حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء میں جب تقسیمِ ہند کا سانحہ پیش آیا تو وہ اپنے والدین کے ساتھ ہجرت کر کے انبالہ آ گئے۔اس کا اثر ان کے فکروفن پر بھی پڑا۔ان کے تخلیقی سفر کا آغاز شعر گوئی سے ہوا مگر کہانیوں سے طبعی مناسبت کی وجہ سے وہ بہت جلد اس کی طرف مائل ہوگئے۔ اردو افسانہ کے معتبر محقق مرزا حامد بیگ کے مطابق ان کا پہلا افسانہ ''تعبیر'' ۱۹۴۴ء میں مرے کالج میگزین میں شائع ہوا تھا۔ان کی باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز ان کی کہانی ''تیاگ سے پہلے'' سے ہوا۔ یہ کہانی ۱۹۴۵ء میں شاہد احمد دہلوی کے مشہور ومعروف رسالہ ''ساقی'' میں شائع ہوئی تھی۔جوگیندر نے ایم اے انگریزی ادب میں کیے اور پیشہ درس وتدریس سے جڑ گئے۔وہ مہاراشٹر کے ایک پوسٹ گریجویٹ کالج کے پرنسپل کے طور پر وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

تخلیقات : جوگیندر پال کی تخلیقات میں افسانوی مجموعے ''دھرتی کا کال ۱۹۶۱ء''، ''میں کیوں سقیم؟ ۱۹۶۲ء''، ''کھودو بابا کا مقبرہ ۱۹۹۴ء''، ''پرندے ۲۰۰۰ء''، ''نہیں رحمان بابو'' (افسانوں کا مجموعہ جس میں کچھ دوسطری تھے) مختصر ناول۔ ''آمدورفت ۱۹۷۵ء''، ''بیانات ۱۹۷۵ء''، ''بے محاورہ ۱۹۷۸ء'' ''بے ارادہ ۱۹۸۱ء''، ''نادید ۱۹۸۳ء''، ''خواب رو ۱۹۹۱ء''۔ یہ دونوں ناول، زیادہ مشہور ہوئے تھے۔

اعزازات: ''سال ۱۹۹۹۔۲۰۰۰ء کا اقبال سمان''، ''سارک حصول حین حیات ایوارڈ (Lifetime SAARC Achievement Award)''، ''قطر کا ایک اُردو تصنیفی ایوارڈ''۔

جوگیندر پال نے اپنی ساری عمر اردو ادب کی خدمت میں صرف کردی۔زندگی کے آخری ایام بسترِ علالت میں گزارے اور ۲۲/اپریل ۲۰۱۶ء کو دارفانی سے رحلت کر گئے۔

مضامین

''افسانچہ'' کہانی کی ایک نئی اور مختصر ترین شکل ہے۔ یہ ایک سطر کا بھی ہوسکتا ہے اور ایک یا دو صفحات کا بھی۔ اِس کا واقعہ انتہائی مختصر مگر تاثر گہرائی کا حامل ہوتا ہے۔ فنّی اعتبار سے افسانچے میں انکسار اور اختصار کے ساتھ ساتھ اِس کے تمام اجزا عین متناسب ہوتے ہیں۔ افسانچے کی فنّی خصوصیات سے متعلق جوگندر پال اپنی تصنیف ''بے اصطلاح'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''تحریر کے ذی جان ہونے کا انحصار درصل اس امر پر ہوتا ہے کہ اس کے وجود سے ہی اس کی ذات کا ادراک ہوجائے۔ ہمارا وجود، بڑا یا چھوٹا، اسی لیے ہمیں بوجھ معلم نہیں ہوتا کہ اس کے سارے اجزاء داخلی اور مقامی ہونے کے باعث عین متناسب ہوتے ہیں۔ کہانی اگر اپنے اصل تناسب سے باہر نہ ہو تو ایک سطری ہو کر بھی پوری ہوتی ہے۔ ورنہ اپنی تمام تر طوالت کے باوصف ادھوری کی ادھوری۔'' (بے اصطلاح، جوگنیدر پال، تخلیق کار پبلیشرز دہلی ۱۹۹۸ء، ص۔۳۸)

جوگیندر کا یہ نقطۂ نظر تھا کہ اردو ایک زبان نہیں بلکہ ایک تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے اور ان کے لیے تہذیب کا حصہ ہونا ادب سے وابستہ ہونا ہی تھا۔ وہ ترقی پسند تحریک کا حصہ تھے۔ ان کی افسانہ نگاری بھارت ہی میں نہیں بلکہ پاکستان کے ادبی حلقوں میں پزیرائی پائی۔ جوگندر پال نے اپنی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے باعث اسے خوب بارآور کیا اور بڑی جدت اور ندرت کے ساتھ اس صنف کو پروان چڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔ ساتھ ہی نئی نسل کو اس سمت متوجہ کر کے ان کی مناسب حوصلہ افزائی بھی کی جس کے نتیجے میں آج کئی نئے لکھنے والوں نے اس صنف میں اپنا نام اور پہچان بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ ہر چند انہوں نے منٹو کے مقابلے میں اس صنف کو شعوری طور پر فروغ دیا، تاہم افسانچہ کے ایجاد کا سہرا منٹو ہی کے سر جانا چاہئے۔ کیوں کہ زمانی اعتبار سے اس طرح کی صنف پہلے ہی وجود میں آچکی تھی بعد ازاں جوگیندر پال نے اسے رواج دیا تھا۔

جوگیندر پال کے یہاں فکری اور فنّی تغیر آہستہ آہستہ آیا ہے اور کئی ایک کہانیوں میں یہ تغیر بلند آواز اختیار کر لیتا ہے۔ ان کے افسانوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے اندر اندر وابستہ نظر آتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے گویا ان کی تمام کہانیوں میں درد و کسک کی ایک لہر ہے جو کبھی اندر کبھی باہر اٹھتی، بیٹھتی رہتی ہے۔ جوگیندر پال کے گہرے مطالعے اور مشاہدے نے انہیں نہ صرف انسانیت کے درد و کرب کو محسوس کرنا سکھایا ہے بلکہ پال اسے کہانی میں ڈھالنے سے قبل اسے اوڑھتے، بچھاتے ہیں، اسے اپنے اندر اُتارتے ہیں پھر وہ خود کہانی بن جاتے ہیں۔ کسی کہانی کا ایک کردار بن جاتے ہیں اور اس طرح جو کہانی وجود میں آتی ہے وہ کہنے کو کہانی ہوتی ہے لیکن حقیقت ہوتی ہے، یہ جوگیندر پال کا کمال ہے۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری جوگندر پال کی افسانہ نگاری کے حوالے سے اپنے ایک مضمون بعنوان ''جوگیندر پال کا تخلیقی کمال'' میں یوں لکھتے ہیں:

''جوگیندر پال کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جو آزادی کے آس پاس سے لکھ رہے ہیں اور جنہوں نے اُردو افسانے کے سفر میں بہت زیادہ نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ کبھی اس نشیب و فراز کا حصّہ بنے اور کبھی خاموش تماشائی بنے رہے۔ ترقی پسند تحریک کا عروج، پال کے بھی شباب کا عہد تھا۔ لیکن ترقی پسند تحریک کے متوازی کچھ افسانہ نگار بالکل منفرد انداز میں افسانے تخلیق کر رہے تھے اور اچھے افسانے لکھ رہے تھے، افسانہ نگاروں کے اسی گروہ میں جوگندر پال بھی شامل ہیں۔ وقت کے ساتھ

ساتھ ترقی پسند تحریک، برائے تحریک اور تشہیر ہوکر رہ گئی۔''
(جوگیندر پال کا تخلیقی کمال، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، اردو دنیا، مارچ ۲۰۱۷ء، نئی دہلی۔ص ۴۸)۔

جوگیندر پال اگر چہ اب ہمارے درمیان نہیں رہے مگر اپنی بیش بہا ادبی تخلیقات کی وجہ سے وہ صدیوں ہمارے دلوں میں زندہ رہیں گے۔ ان کا شمار اردو کے چند گنے چنے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے فکروفن کے نئے دریچے کھولے اور فن افسانہ نگاری میں وسعت پیدا کی۔ ان کے افسانوں میں موضوعات کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ وہ اپنے افسانوں کے موضوعات براہ راست زندگی سے اخذ کرتے ہیں اور کرداروں کے مکالموں کے ذریعے اصل مسئلہ کی طرف کچھ اس طرح اشارہ کرتے ہیں کہ وہ قاری کے حافظہ کا حصّہ بن جاتا ہے۔ موضوعات کی پیش کش کا یہ طریقہ جوگیندر پال کی فکر کی گہرائی اور وسعت کو ظاہر کرتا ہے اور ان کی انفرادیت کا پتہ دیتا ہے۔ وہاب اشرفی ان کی افسانہ نگاری کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''جوگیندر پال اپنے افسانوں کے موضوعات کے لیے زندگی کے مسائل کی طرف براہ راست رجوع کرتے ہیں اور ان پر اپنے کرداروں کی زبان سے خاصے تیکھے تبصرے کرواتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا یہ تیور انھیں ایک فکری ساخت دے دیتا ہے اور ان کی انفرادیت نئے لکھنے والوں میں مسلم ہوجاتی ہے۔'' (وہاب اشرفی، جوگیندر پال فن اور شخصیت، مشمولہ، جوگندر پال، ذکر، فکر، فن، مرتب، ارتضی کریم، ۱۹۹۹ء نئی دہلی، ص۔۱۵۸)

جوگیندر پال کی افسانہ نگاری کا ابتدائی زمانہ کینیا، جنوبی افریقہ میں گذرا۔ وہاں وہ ایک طویل عرصہ تک مقیم رہے۔ اس دوران انہوں نے وہاں کے لوگوں کی زندگی اور اس کی پیچیدگیوں کو بہت قریب سے دیکھا اور اس زندگی کے گوناگوں مسائل ومشکلات کو اپنے افسانوں میں سمونے کی کوشش کی۔ اس لیے ان کے ابتدائی افسانے افریقی زندگی اور ماحول کے عکاس نظر آتے ہیں۔ ان افسانوں میں انہوں نے مشرقی افریقہ کے سیاسی اور سماجی ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے اس سرزمین پر انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ اور انگریزوں کے ذریعے افریقیوں پر ہوئے مظالم واستحصال اور ان کی دُکھ بھری زندگی کو موثر انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ جوگیندر پال جب جنوبی افریقہ سے مکمل طور پر واپس ہندوستان آئے تو وہ کچھ دنوں حیدرآباد میں رہے۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک اورنگ آباد پھر مکمل طور پر دہلی میں قیام پذیر ہوئے۔ انہوں نے ہندوستان کے چھوٹے بڑے مختلف شہروں کی زیارت کی۔ اس سے انھیں انسانی زندگی کو الگ الگ رنگوں میں دیکھنے کا موقع ملا، ان کے مشاہدہ میں وسعت پیدا ہوئی اور مختلف مسائل وموضوعات نے ان کے افسانوں میں جگہ پائی۔

☆☆☆

سبزار سکندر سہہ
ریسرچ اِسکالر، سینٹرل یونی ورسٹی آف حیدرآباد
فون نمبر 7006234934

رباعی

ہر جلوے سے اک درس نمو لیتا ہوں
چھلکے ہوئے صد جام و سبو لیتا ہوں
اے جانِ بہار تجھ پہ پڑتی ہے جب آنکھ
سنگیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہوں

فراقؔ گورکھپوری

نندکشور وکرم کی افسانہ نگاری

نندکشور دت کا قلمی نام نندکشور وکرم ہے۔ان کی پیدائش ۱۷ستمبر ۱۹۲۹ء میں روال پنڈی شہر (پاکستان) میں ہوئی۔وہ افسانہ نگار، ناول نگار اور صحافی کے علاوہ ایک اچھے مترجم بھی تھے۔نندکشور وکرم کے والد کے تبادلے اور خانگی حالات کی وجہ سے اُن کی تعلیم ایک جگہ نہ ہوسکی۔انہوں نے پہلی جماعت کی تعلیم سناتن دھرم پرائمری اسکول راول پنڈی سے ہندی میں حاصل کی۔اس کے بعد ان کے والد کا تبادلہ گجر خان ہوگیا اور انہیں از سر نو سناتن دھرم مڈل اسکول گجر خان میں پہلی جماعت میں داخلہ لینا پڑا، کیونکہ وہاں ہندی کے بجائے اردو میڈیم میں پڑھایا جاتا تھا۔جب انہوں نے دوسری جماعت پاس کی تو ان کے والد کا تبادلہ کہوٹہ ہوگیا۔اسی دوران نندکشور وکرم کی والدہ بیمار ہوگئیں اور انہیں مجبوراً اپنے ننھال آکر تیسری جماعت میں داخلہ لینا پڑا۔یہیں سے انہوں نے ۱۹۴۵ء میں ورنیکولر کا امتحان پاس کیا اور پھر روال پنڈی آکر سناتن دھرم ہائی اسکول میں نویں جماعت میں داخلہ لیا۔دسویں جماعت کے امتحان کے دوران ہی فسادات شروع ہوگئے اور نقل مکانی کر کے ان کے افرادِ خانہ انبالہ آگئے اس کے بعد نندکشور وکرم نے ایف۔اے کے لئے ڈی۔اے کالج ابنالہ میں داخلہ لیا۔ایف۔اے مکمل کرنے کے بعد ۱۹۶۵ء میں انہوں نے ایم۔اے فارسی کی ڈگری پنجابی یونیورسٹی کے کیمپ کالج نئی دہلی سے حاصل کی۔اس کے بعد ۱۹۶۶ء میں دہلی یونیورسٹی سے انہوں نے ایم۔اے اردو کی سند حاصل کی۔پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ سے ادیب فاضل کا کورس کرنے کے علاوہ انہوں نے فلم اینڈ ٹی۔وی انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا پونے سے سرٹیفکیٹ برائے فلم اپریسیشن کی سند بھی حاصل کی۔نندکشور وکرم کی ابتدائی تعلیم و تربیت میں ان کی نانی کا کلیدی رول رہا ہے۔

نندکشور وکرم نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔شروع شروع میں ان کی کچھ غزلیں اور نظمیں اخبارات و رسائل میں بھی شائع ہوئی تھیں۔انہوں نے شاعری میں اپنا تخلص مغلوب رکھا تھا۔لیکن ان کا یہ تخلص اپنی ذاتی ڈائری تک ہی محدود رہا۔بعد ازاں انہوں نے شاعری کا خیال ترک کر دیا کیوں کہ انہیں بحور اور اوزان کی زیادہ سوجھ بوجھ نہیں تھی۔شاعری ترک کرنے کے متعلق مزید لکھتے ہیں۔

''میں نے شاعری کا خیال اس لئے ترک کر دیا کیونکہ مجھ میں بحور اور اوزان کی کچھ زیادہ سوجھ بوجھ نہیں تھی اور مجھے شاعری وقتی شغل معلوم ہوئی۔مجھے لگا کہ اپنے خیال کی پوری توضیح نظم میں ممکن نہیں۔شاعری خیالات، تاثرات اور جذبات کی پوری اور تفصیلی وضاحت کی اہل نہیں اس کے برعکس نثر میں ہر بات کو تفصیل سے بیان کیا جاسکتا ہے۔'' (نندکشور وکرم مشترکہ وراثت کا آخری داستان گو، مشرف عالم ذوقی ،ص ۱۱۳)

شاعری ترک کرنے کے بعد انہوں نے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔انہوں نے اپنی پہلی کہانی ہفتہ وار''چترا'' لاہور کو بھیجی تھی اس کی اشاعت کب ہوئی اس کے بارے میں کوئی جانکاری فراہم نہیں ہوئی۔تقسیم ہند کے فوراً بعد نندکشور وکرم نے اپنی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز افسانہ نگاری سے کیا اور پہلا افسانہ''ادیب'' لکھا جو ماہنامہ''نرالا'' نئی دہلی میں دسمبر ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ''آوارہ گرد'' کے نام سے ۱۹۹۸ء میں ان کے نجی

مضامین

ادارے پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز سے شائع ہوا۔اس افسانوی مجموعے میں دس افسانے جن میں آوارہ گرد،دیوانہ،سرحد پر،سنی ٹوریم کے دروازے پر،طول شب فراق،عجیب لڑکی،کتا،ماضی اور حال،مٹی کی خوشبو اور منزل نمائندہ افسانے شامل ہیں۔اس کے علاوہ اس مجموعے میں ایک ڈرامہ'' آزادی کے بعد'' بھی شامل ہے۔اس مجموعے پر ڈاکٹر انور سدید اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

'' نند کشور وکرم کے افسانوں میں اپنا چھوٹا ہوا دیار (راولپنڈی) ایک عجیب ناسٹلجی کیفیت پیدا کرتا ہے۔لیکن ان کا افسانہ اس وقت زہر رنگ ہو جاتا ہے جب اس دیار سے نکلے ہوئے کرداروں کو زندگی بار بار کڑیالے سانپ کی طرح ڈسنے لگتی ہے۔نند کشور کے نزدیک افسانہ محض فن نہیں بلکہ زندگی کا وہ رابطہ ہے جو ماضی اور حال کو مستقبل کی طرف سفر کرنے کے لیے آگہی عطا کرتا ہے۔''
(ایضاً،ص ۳۱۸)

نند کشور وکرم کا دوسرا افسانوی مجموعہ'' آدھا سچ'' کے نام سے ۲۰۰۷ء میں ان کے نجی ادارے پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر دہلی سے شائع ہوا۔بعد میں اس مجموعے کا بھی ہندی میں ترجمہ کر کے ۲۰۱۰ء میں اپنے نجی ادارے سے شائع کیا۔اس مجموعے میں کل چودہ افسانے شامل ہیں جن میں آدھا سچ، آوارہ گرد،انتم پروچن،ایک پاکستانی کی موت،خود ندامتی،رشتے کا نام،زمین میں دفن سچائی،سہما ہوا آدمی،سنی ٹوریم کے دروازے سے،طول شب فراق،عجیب لڑکی اور کابلی والا کی واپسی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

نند کشور وکرم کا تیسرا اور آخری افسانوی مجموعہ''ادھوری کلیات'' ۲۰۱۸ء میں ان کے نجی ادارے سے شائع ہوا۔اس مجموعے میں تیس افسانے شامل ہیں جن میں کہانی کی کہانی،آوارہ گرد،دیوانہ،سرحد پر،سنی ٹوریم کے دروازے سے،طول شب فراق،عجیب لڑکی،کتا،ماضی اور حال،منزل،مونالیزا کے آنسو، رشتے کا نام،بگل والا کامریڈ بابا،تعبیر خوابوں کی،چھچو بھگت،خود ندامتی،زمین میں دفن سچائی،سہما ہوا آدمی،سنی ٹوریم کے دروازے سے،کاگا سب تن کھائیو،انتم پروچن،ایک اور سیتا،ایک پاکستانی کی موت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اس افسانوی مجموعے کے بارے میں مصنف یوں لکھتے ہیں:

''یہ میرا آخری افسانوی مجموعہ ہے۔اس کے بعد کوئی نیا مجموعہ منظر عام پر نہیں آئے گا اور اگر مستقبل میں کوئی افسانہ اشاعت پذیر ہو بھی گیا تو اسے اسی ادھوری کلیات میں شامل کر دیا جائے گا اور اسے ہی میرا آخری افسانوی دستاویز سمجھیں''۔
(ادھوری کلیات،نند کشور وکرم،ص ۲۶۴)

نند کشور وکرم نے تقسیم ہند،ہجرت اور فسادات کے علاوہ بے روزگاری،نفسیات،غریبی،بے جا مذہبی رسومات اور ذات پات وغیرہ جیسے موضوعات پر بھی بہترین افسانے تحریر کیے ہیں۔انھوں نے تجریدیت اور علامت نگاری سے انحراف کر کے حقیقت نگاری کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ان کے تمام افسانے حقیقت اور صداقت پر مبنی ہیں۔وہ اپنے عہد کی بے رحم سچائی کی حقیقی تصویر اپنے افسانوں میں بہت ہی کامیابی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔انھوں نے اپنے افسانوں میں (Nostalgia) کا استعمال بھی کیا ہے اور ان کے افسانوں میں اکثر و بیشتر ان کے ماضی کے حالات و واقعات کی جھلک ملتی ہے۔ماضی ان کے اسلوب کی طاقت ہے۔ان کا ماضی جہاں اپنی خوشگوار یادوں کی گرہیں کھولتا ہے وہیں حال کو بھی آئینہ دکھاتا ہے۔

''کابلی والا کی واپسی'' نند کشور وکرم کا ایک مشہور افسانہ ہے جس میں انھوں نے امریکی دہشت گردی کو موضوع بنایا ہے۔اس افسانے میں غریب ومظلوم افغانستان اور عراق کی تباہی و بربادی کی تصویر کو بہت ہی خوبصورتی اور کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

''سہا ہوا آدمی'' نند کشور وکرم کا ایک اہم نفسیاتی، سماجی اور اصلاحی افسانہ ہے۔اس افسانہ کی کہانی دو نوجوانوں راجن اور رنجنا کے گرد گھومتی ہے جو ایک دوسرے کو شدت کے ساتھ چاہتے ہیں۔دونوں اپنے خاندان کی اجازت کے بغیر گھر سے بھاگ کر شادی کر لیتے ہیں۔جب ان دونوں کی بیٹی ریما جوان ہو جاتی ہے تو وہ سہما سہما سا رہتا ہے اور راجن کو یہ خوف ستانے لگتا ہے کہ کہیں اس کی بیٹی بھی اسی طرح بھاگ کر کسی سے شادی نہ کر لے۔اسی ذہنی اور نفسیاتی دباؤ میں وہ ہمیشہ اداس اور فکر مند رہنے لگتا ہے۔بیٹی ریما کے گھر آنے میں جب بھی تاخیر ہوتی تو راجن کے دل میں تمام طرح کے وسوسے اور خیالات پیدا ہوتے تھے۔اسی سبب سے راجن کی پریشانیوں میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کی پریشانی اور گھبراہٹ اسے انتشار میں مبتلا کر دیتی ہے۔راجن کی بیوی رنجنا کے لاکھ سمجھانے کا بھی اس کے اوپر اثر نہ ہوا۔اسی درمیان رنجنا کے چاچا کی بہن شاردا اپنے شوہر سچدیو کے ساتھ امریکہ سے ملنے کے لیے راجن کے گھر آتی ہے۔وہ اپنے لڑکے کے لیے ریما کو پسند کر لیتے ہیں اور آخر کار ان دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ریما کی شادی کے بعد بھی راجن کی فکر میں کوئی تبدیلی نہیں آتی ہے۔مگر کچھ دنوں کے بعد جب امریکہ سے ڈاکٹر سچدیو فون پر یہ خبر دیتے ہیں کہ ان کی بیٹی ریما کو بیٹا پیدا ہوا ہے اور آپ نانا بن گئے ہیں۔تب راجن کو اطمنان ہو جاتا ہے اور وہ پہلی بار گہری نیند سوتا ہے۔

نند کشور وکرم کے افسانوں کا اسلوب و بیان نہایت ہی سادہ اور عام فہم ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں زبان و بیان کا خاص خیال رکھا ہے۔ان کے افسانوں کے کردار جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ان کی زبان بھی اسی طبقے سے مماثلت رکھتی ہے۔انھوں نے کرداروں کے ذریعے حالات کے مطابق زبان کا استعمال کیا ہے جس سے قاری کی دلچسپی کہانی پڑھتے وقت برقرار رہتی ہے۔وحدت تاثر کے اعتبار سے بھی نند کشور وکرم کے افسانے فن کی کسوٹی پر پورا اترتے ہیں۔ان کے افسانوں کو پڑھتے وقت قاری کا تجسس آخر تک برقرار رہتا ہے اور قاری کے ذہن پر دیرپا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔مجموعی حیثیت سے دیکھیں تو نند کشور وکرم اردو کی افسانوی روایت میں اپنا الگ مقام رکھتے ہیں، چوں کہ وہ ایک صحافی کی حیثیت سے بھی اپنے عہد کے حالات و واقعات پر گہری نگاہ رکھتے تھے اور یہی عصری شعور ان کے افسانوں کے ثقافتی بیانیہ کی تشکیل کرتا ہے۔اس لیے ان کی افسانہ نگاری کا اعتراف کرنا ہر ذی شعور قاری کے لیے ناگزیر بن جاتا ہے۔

☆☆☆

عارف حسین ڈار
پی ایچ۔ڈی ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد
رابطہ: 7006234087

مضامین

اڈیشا کا غیر مسلم شاعر: گوتم مترا گوتمؔ

ہندو مسلم تہذیب کی علامت کے بطور اردو ہی کو پیش کیا جاتا ہے۔ زمانہ قدیم سے ہی اردو زبان و ادب کو اہمیت حاصل ہے۔ زبان کبھی کسی قوم کی میراث نہیں ہوتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اردو زبان اتنی شیرین اور دلکش ہے کہ ہر کوئی با آسانی بولتا ہے اور سمجھتا ہے۔ یہ بھی ایک سچ ہے کہ اردو زبان کے آغاز سے ہی ہر مذہب و ملت کے لوگوں نے اس کو سجانے سنوارنے میں اپنی تمام تر کوشش لگا دیں۔ حضرت امیر خسروؔ اور ولیؔ دکنی سے لے کر موجودہ دور تک نہ جانے کتنے قلم کاروں نے اپنے خون جگر سے اس زبان کو سینچا ہے۔ جو لوگ اردو زبان کو مسلمانوں کی زبان کہہ کر فراموش کرنا چاہتے ہیں ان کا جواب وہ ہزاروں غیر مسلم شعرا و ادیب ہیں جنھوں نے اردو زبان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

اڈیشا ایک ایسی ریاست ہے جہاں ہمیشہ سے مختلف تہذیبوں کی آمیزش ہوتی رہی ہے، اور اس آمیزش کی وجہ سے یہاں کی زبان و ادب میں کئی خصوصیت پائی جاتی ہیں۔ اڈیشا میں اردو بولنے والوں کی تعداد دیگر ریاستوں کی نسبت بہت کم ہے اور یہ اردو کے مرکز سے بھی کافی دور پر واقع ہے۔ اس کے باوجود یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ یہاں بھی اردو کے شعرا اور قلم کار موجود ہے۔ اڈیشا کے ادبی منظر نامہ پر نظر ڈالیں تو قابل غور یہ ہے کہ جہاں اڈیشا میں مسلم شعرا اور ادیبوں نے اردو زبان کو زندہ رکھنے میں حصہ لیا ہے وہیں غیر مسلم شعرا نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔

اڈیشا کے غیر مسلم شعرا میں ہردے رام جودتؔ کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ ہردے رام جوتؔ اڈیشا میں اردو کا اولین شاعر سمجھا جاتا ہے۔ بیسوی صدی کی شروعات میں لکشمی نارائن مشرا نے بھگوت گیتا کو اردو کا جامہ پہنایا۔ کرشن کمار پرجاپتی نے ''سوچ کی تیلیاں'' کے نام سے ایک شعری مجموعہ شائع کروایا، جو کہ اردو میں ہے۔ اس کے علاوہ اردو کو اپنانے والے شاعروں میں گجراتی رشمی کانت راہی صاحب (آنجہانی) جو کئی پشتوں سے کٹک میں مقیم ہے جن کا شعری مجموعہ ''حرف مسبب'' شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکا ہے۔ موجودہ دور میں جس غیر مسلم شاعر نے اپنا نام اردو دنیا میں بنا رکھا ہے وہ گوتم مترا گوتم ہے۔

گوتم مترا گوتم نام اور گوتم تخلص۔ 26 جولائی 1968ء میں اڈیشا کے ضلع کٹک میں پیدا ہوئے۔ گوتم مترا اڈیشا کے ادبی ماحول میں پلے بڑھے ہیں، کئی ادبی اداروں سے ان کا لگاؤ ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ طالب علمی کے زمانہ سے ہی انہیں اردو غزل اور نظم سننے کا شوق تھا۔ جس کی وجہ سے وہ بڑے بڑے اردو شعرا کے کلام کو کیسٹ پر سنتے تھے، پھر یہ شوق اتنا بڑھ گیا کہ وہ خود شعر کہنے لگے اور اڈیشا کے مشہور شاعر ساجد اثر اور سعید رحمانی سے اصلاح لینے لگے، ساتھ ہی ساتھ مشاعروں میں اپنی غزل سنا کر داد تحسین حاصل کرتے رہے۔ ان کی شاعری مسلسل مختلف اخبارات اور رسائل کی زینت بنتی رہی۔ ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''عرض کیا ہے'' 2008ء میں منظر عام پر آ کر داد تحسین حاصل کر چکا ہے۔

کسی بھی شاعر کے کلام پر قلم اٹھانے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہوتا ہے کہ وہ کس سماجی سطح سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا تعلیمی معیار کیا ہے، اسکی ذاتی دلچسپیاں کیا ہیں، اس کا ادبی شعور، اس کا احساس، اس کی سوچ وفکر، اس کے قلم اٹھانے کا ڈھنگ اور سلیقہ کیسا ہے۔ گوتم مترا ہر مذہب، ہر دھرم اور ہر ملت کے ماننے والوں

کا احترام کرتے ہیں۔ان کی حمد ونعت میں عقیدت کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے ساتھ ہی سنجیدگی اور برجستگی بھی خوب ہے۔ان کی حمد میں مقطع بڑے دلکش انداز سے کہا گیا ہے جس کے حرف میں شاعر کے دل کی پاکیزگی نمایاں دیکھی جاسکتی ہے:

جس میں گوتم اُس کی ہو سچی لگن
قُرب حق دراصل پاتا ہے وہی

اسی طرح نعت گوئی میں بھی اپنا کمال رکھتے ہیں۔جب نعت کہتے ہیں عشق رسول میں ڈوب کر اپنے منفرد انداز میں شعر بیان کرتے ہیں۔جس کا اندازہ نعت کے اس شعر سے لگا سکتے ہیں جس میں معراج کی طرف اشارہ ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ سارے انبیاء میں صرف ہمارے نبی محمد رسول ﷺ کو ہی یہ شرف حاصل ہوا ہے:

معراج کا شرف تو فقط آپ کو ملا
عظمت کے آسمان پہ چمکا کوئی نہیں

مجموعہ میں شامل ان کی ایک نظم بعنوان ''ماں'' ہے۔اس نظم میں انہوں نے ماں کی عظمت اور اپنی محبت کو بڑے خلوص سے پیش کیا ہے۔ماں بغیر کسی بحث ومباحثہ کے قابل احترام ہے۔ماں ایک ایسا شجر ہے جس کے تلے بچہ اپنی دنیا بناتا ہے،اس کا دل رحم سے بھرا ہوتا ہے۔ماں کے قدموں میں جنت ہے یہ ہم اور آپ سب جانتے ہے۔گوتم مترا نے اس کو نظم میں اس طرح بیان کیا ہے کہ ماں کی پوری عظمت ہمارے سامنے ابھر کر آجاتی ہے،جسے پڑھتے ہی دل متاثر ہوتا ہے۔نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں:

اس کی ممتا ہے آسماں شے
اک مُعزز بشر ہے میری ماں
اس کے قدموں تلے ہی جنت ہے
شک نہیں مُعتبر ہے میری ماں
جو بھی کہتا ہوں مان جاتی ہے
رحم دل کس قدر ہے میری ماں

ان کی اور ایک نظم ''بیٹی'' ہے۔بیٹی دنیا کی وہ نعمت ہے جس کے ہونے سے گھر خوشیوں سے بھر جاتا ہے یا یوں کہیں گھر مکمل ہوتا ہے۔مگر آج کے ہمارے سماج میں کچھ لوگ ایسے بھی ہے جو بیٹی کو کولٹا،بدنصیب سے مخاطب کرتے ہیں۔گوتم مترا کے گھر جب بیٹی پیدا ہوتی ہے تو اسے رب کی مہربانی سمجھتے ہوئے کہتے ہیں۔

مقدر نے کی مجھ پر جو مہربانی
مرے گھر میں آئی بہاروں کی رانی

گوتم مترا کی شاعری کا محور ہی محبت ہے۔وہ بڑی رفاقت کے ساتھ غم کو نظم میں بیان کرتے ہیں،بلکہ یوں کہا جائے کہ ہر انسان کے غم کو اپنا غم بنا کر اس کا کھلے دل سے اظہار کرتے ہیں،جو ان کی صاف دلی کی پہچان ہے۔ان کی شاعری کی زبان شہد میں گھلی ہوتی ہے،اشعار میں اس طرح کی روانگی و سادگی کا عالم ہے کہ پڑھتے وقت ذہن میں نرمی کا احساس ہوتا ہے۔گوتم صاحب قنوطیت سے دور رہتے ہیں اور ناامیدی سے گریز کرتے ہے۔وہ اپنے دل وہ ذہن میں امیدوں کو ہمیشہ زندہ رکھتے ہیں۔جس کا اندازہ ان کے اس شعر سے لگا سکتے ہیں:

آس کی شمع جلاؤ کہ میں زندہ ہوں ابھی
روشنی اور بڑھاؤ کہ میں زندہ ہوں ابھی

شاعری شخصیت کی ترجمان ہوتی ہے،شخصیت مزاج کی شگفتگی سے بنتی ہے۔مزاج کی شگفتگی جذبے کو پروان چڑھاتی ہے۔جذبہ جب شعر کے پیکر میں ڈھلتا ہے تو وہ ایک ایسا سمندر بنتا ہے جس میں شاعری شخصیت کی دلکشی،اس کے مزاج کی شائستگی، اس کے بزرگوں کی وارثت اور اس کے ذہن کی تازگی پوشیدہ ہوتی

ہے۔گوتم مترا کے کلام کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے شعر میں یہ ساری خوبیاں موجود ہیں۔ان کی خوبیوں کی تعریف کرتے ہوئے شوق جالندھری یوں لکھتے ہیں:

''گوتم صاحب کی غزل گوئی بھی اپنے اندر لطافت، نفاست اور سلاست کے خزانے سمیٹے نظر آتی ہے۔انہوں نے مختصر اور طویل بحروں میں کامیاب شعر کہے ہیں۔اُن کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ طویل ردیف کے ساتھ انہوں نے بہت دل آویز اور مرصع غزلیں کہی ہیں۔'' (گوتم مترا گوتم، عرض کیا ہے، ص۔18)

گوتم مترا گوتم اپنے معاشرے پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔بعض موضوع پر وہ تنقید کا پہلو برائے اصلاح اختیار کرتے ہیں۔ویسے تو وہ تنقید سے گریز کرتے ہیں مگر کہیں کہیں ان کے لہجے میں سختی آجاتی ہے۔یہ تو ایک طرح کے عمل کا ردعمل ہے جو بالکل فطری ہے:

پھن اُٹھاتا ہے سانپ نفرت کا
اس کو پیروں تلے کچلنا ہے!

گوتم مترا کا کلام اتنا رواں، اتنا عام فہم، اتنا دلکش، اتنا پراثر ہے کہ ہم ان کے مجموعہ کو اردو کے چند اہم شعری مجموعوں میں شمار کرسکتے ہیں۔انھیں زبان و بیان پر مکمل قدرت حاصل ہے۔ ان کا کلام فنی خوبیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے۔ان کی شاعری میں بے باک پن، افکار کی پاکیزگی، فکر کی ایک ایسی روش ہے جو صرف حساس شخصیت کو ہی میسر آسکتی ہے۔یہ ان کے احساسات ہی کا کمال ہے جس نے ان کے پاکیزہ خیالات کی ترجمانی کے لئے اردو جیسی شریں زباں کو ذریعہ بنایا ہے۔ان کے باغیانہ پن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پیش قدمی کی تمنا ہے مگر
ہوں تھکن سے چُور رحمٰن الرحیم
جس نے برباد کردیا مجھ کو
میں اسی کے لئے پریشاں ہوں

ان کی شاعری میں یکجہتی روح رواں نظر آتی ہے۔وہ رواداری اور انسانی ہم آہنگی پر بات کرتے ہیں۔انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ انسانی ضمیر کو بیدار کرنے کی مکمل کوشش کی ہے۔ ان کی سوچ میں سچائیاں جھلکتی ہیں اور برجستگی کے ساتھ ذات و کائنات کے دکھ سکھ کو بیان کردیتے ہیں۔آج پورا ہندوستان آزادی کا مہااتسو منا رہا ہے اور ہر گھر ہر جگہ ترنگا لہرایا جارہا ہے۔ گوتم مترا نے جشن آزادی پر کیا خوب نظم کہیں ہے۔نظم کا چند بند یہاں پیش ہے:

چلو اس بار مل کر جشن آزادی منائیں ہم
یہی موقع ہے ساری تلخیوں کو بھول جائیں ہم
کبھی ہم ایک تھے پھر ایک ہوں گے دل میں حسرت ہے
پرانے رابطوں کو اک نئی منزل دکھائیں ہم

☆☆☆

گلنارا خاتون
ریسرچ اسکالر
gulnarakhatoong@gmail.com

اردو ناول کے غیر مسلم نقاد

اردو ایک ہندوستانی زبان ہے جس کا ماخذ و مسکن، گھر بار، میکہ و سسرال سب ہندوستان ہی ہے۔ میں تو یہاں تک کہتی ہوں کہ اگر کسی کو گنگا جمنی تہذیب دیکھنی ہو یا ہندوستان کی روح میں پیوست ہندو مسلم اتحاد اور بھائی چارہ کے رس کو سمجھنا ہو تو وہ اردو کے ادب پاروں کا ضرور مطالعہ کرے کیونکہ اس کے بغیر ہندوستانی تہذیب کو سمجھنا تقریباً ناممکن ہے۔ یہ بات کسی سے بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ اردو ہندوستانی تہذیبی و ثقافتی ملکیت کی سچی جانشین ہے۔ کیوں کہ اس زبان کی پیدائش ہی دونوں مذاہب کے پیروکاروں کے اتصال اور آپسی میل جول سے ہوئی اس طرح یہ دونوں مذاہب کی مشترکہ زبان قرار پائی اگر ہم اردو ادب کی بات کریں تو یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ اردو ادب کا کوئی بھی باب غیر مسلم ادبا کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ نثر ہو یا نظم تمام اصناف سخن میں غیر مسلم ادبا و شعراء نے نہ صرف اپنے کمالات کے جوہر دکھائے ہیں بلکہ اپنی فنکاری اور علمیت سے اصناف ادب کو ایک نئی بلندی عطا کی ہے۔ ہم یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اردو شاعری کی روایت دیا شنکر نسیم، چکبست، فراق گورکھپوری، کرشن بہاری نور، جگن ناتھ آزاد، گلزار دہلوی اور کنور مہندر سنگھ بیدی کو شامل کئے بغیر کبھی بھی مکمل نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح اگر ہم اردو نثر سے پنڈت رتن ناتھ سرشار، اوپندر ناتھ اشک، پریم چند، کرشن چند، گوپال متل، بیدی، سریندر پرکاش، کنہیا لال کپور وغیرہ کو شامل نہ کریں تو پھر اردو نثر میں کیا بچے گا نہ ہم ناول کی تاریخ مکمل کر سکتے ہیں نہ افسانے کی نہ رپورتاژ کی اور نہ ہی انشائیہ کی۔ غرض کے اردو ادب کا وجود اور اس کی ترویج و اشاعت دونوں مذاہب کی مشترکہ کاوشوں کا ثمر ہے۔ اردو تنقید کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ غیر مسلم ناقدین کے بغیر تنقیدی روایت مرتب کرنا سعی لاحاصل ہے۔ اس راہ میں اٹھایا جانے والا ہر قدم بے سود اور فضول ثابت ہوگا۔ ہم اس مضمون میں ناول تنقید کے حوالے سے گفتگو کر رہے ہیں اسی لیے صرف ان نقادوں کا ہی احاطہ کرنے کی کوشش کریں گے جنہوں نے ناول پر تنقید کی ہے جن کا ذکر ذیل میں یکے بعد دیگرے پیش کیا جائے گا۔

وہ غیر مسلم ناقدین جنہوں نے ناول پر تنقیدی قلم اٹھایا ہے ان میں ایک اہم نام گیان چند جین کا ہے۔ انہوں نے جہاں اردو تحقیق میں لافانی خدمات انجام دیے ہیں وہیں تنقید میں بھی گراں قدر خدمات دے کر اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا ہے۔ انہوں نے بہت زیادہ تنقیدی مضامین تو نہیں لکھا لیکن جتنا لکھا خوب لکھا۔ ان کے تنقیدی مضامین میں بھی تحقیق کا عکس صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کے مضامین کی روشنی میں یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے تنقید میں سائنسی طریقہ کار کو اپنایا ہے۔ ان کی تنقید کا غالب رجحان اعتدال پسندی ہے۔ لیکن یہ معتدل رویہ ان کی تنقید میں خلا پیدا نہیں کرتا وہ دوٹوک فیصلہ کرنے کے بجائے اپنے نظریے کی تشریح و توضیح میں سمجھنے سمجھانے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ انہوں نے کئی سارے تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ جن میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ناول ''فسانہ آزاد'' بعنوان ''ناول نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار'' اوپندر ناتھ اشک کا ناول ''گرتی دیواریں'' بعنوان ''گرتی دیواریں، ایک عظیم ناول'' اور کرشن چند کی ناول نگاری پر لکھا گیا مضمون بعنوان ''کرشن چندر، ایک تاثر'' قابل ذکر ہے۔

مضامین

فسانہ آزاد پر لکھا گیا ناول تحقیق و تنقید دونوں اعتبار سے اہم ہے۔گیان چند جین فسانہ آزاد کے حوالے سے جہاں کئی نئے انکشافات کرتے ہیں وہیں انہوں نے فنی وموضوعاتی سطح پر تنقید و تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔وہ فسانہ آزاد کی تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ان کی شہرت کا مدار فسانہ آزاد پر ہے۔یہ کچھ اس طرح پھیلا اور بکھرا ہوا ہے کہ اسے داستان اور ناول کی درمیانی کڑی کہنا چاہئے۔تکنیک کے اعتبار سے یہ داستان کا مشابہ ہے لیکن اس میں ناول کا وہ اہم ترین وصف پایا جاتا ہے زندگی کا قرار واقعی بیان''(ذکروفکر،ص۱۲۲)

اس طرح کا واضح تبصرہ اور تقابلی تجزیہ وہی کرسکتا ہے جسے داستانوں کا گہرا علم اور اس کی روایت سے بھرپور واقفیت ہو۔ہم یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس لحاظ سے گیان چندجین کی شخصیت مسلّم ثبوت ہے۔انہوں نے اردو داستانوں اور مثنویوں کا جس گہرائی سے مطالعہ کیا ہے شاید ہی کسی ادیب نے کیا ہوگا۔ گیان چند نے اوپندر ناتھ اشک کے ناول''گرتی دیواریں''پر بھی بہترین تنقید کی ہے ناول کا فن اور اس کے کرداروں کے حوالے سے کئی سوالات کھڑا کیے ہیں جس سے ان کی ناقدانہ بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

''ا۔ چیتن اپنی تمام جنسی کارستانیوں اور ناکامیوں کو اپنے بھائی پر افشا کر کے اس سے مشورہ کرتا ہے کم ازکم میں اپنے بڑے بھائی سے جنسیات پر بات نہیں کرسکتا''

۲۔ میں نے اعتراض کیا کہ چیتن نے اعتراض کیا کہ چیتن نے رات کو بھیرویں کیسے گائی۔میوزک کانفرنس میں کسی چیلے کو گوانے سے پہلے استاد شاگرد کو ہدایت دے گا کہ اسے کون سا راگ گانا ہے اور اس کی مشق کرادے گا۔

۳۔ میرا اعتراض تھا کہ چیتن ڈراما،انارکلی ،میں زعفران کے پارٹ میں اسٹیج پر چشمہ لگا کر کیسے جاسکتا ہے کیونکہ ڈائرکٹر کو اسٹیج پر بھیجنے سے قبل سب کچھ دیکھ بھال کر بھیجتا ہے''۔ (مقدمے اور تبصرے،ص۱۰۳)۔

یہ تمام اعتراضات اپنی جگہ بجا اور بالکل درست ہیں۔اشک نے جن روایتی اور نفسیاتی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کی ہے وہ ہمارے سماجی اقدار کا اٹوٹ حصہ ہے۔بڑے اور چھوٹے بھائی کے درمیان اخلاقی رشتہ ہوتا ہے جو ایسے سوالات یا جنسی مسائل پر گفتگو کی اجازت نہیں دیتا۔چیتن اور کیسر کی خفیہ محبت بھی جداگانہ ہے دلی قربت اور تمام تر تعلقات کے باوجود ان دونوں کے درمیان جنسی رشتہ استوار نہیں ہو پاتا ہے۔جبکہ دونوں کی قربت اور ایک دوسرے سے لگاؤ کے سیاق میں یہ غیر فطری معلوم ہوتا ہے مگر جب خود اشک نے ہی ان اعتراضات کے جوابات و جوازات خط میں لکھ بھیجے اور ہر واقعے کو اپنی زندگی کا تجربہ اور آپ بیتی بنا کر پیش کردیا تو ایسی صورت میں اعتراضات کی گنجائش باقی نہ رہی۔اس حوالے سے جین خود لکھتے ہیں۔

''جب یہ واقعات خود اشک صاحب کے تجربے ہیں تو آگے بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی اس سے مزید ظاہر ہوگیا کہ ناول سوانحی ہے''(مقدمے اور تبصرے،ص۱۰۴)

گیان چند جین کا ایک مضمون جو''کرشن چندر ایک تاثر''کے عنوان سے موجود ہے میرے خیال میں کرشن چندر کے حوالے سے لکھے گئے تمام مضامین میں اعلی مقام رکھتا ہے اس مضمون میں کرشن چندر کی ناول نگاری اور ان کے فن پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔انہوں نے بحثیت ناول نگار کرشن چندر کے حوالے سے جو باتیں کہی ہیں وہ چونکا دینے والی ہیں۔وہ لکھتے ہیں۔

''انھوں نے بکثرت ناول لکھے ہیں لیکن میری رائے میں وہ ناول نگار سے بہتر افسانہ نگار تھے۔ان کا بہترین ناول شکست ہےاور وہ ایک رومانی ناول ہے۔اردو کے پچاس بہترین افسانوں کا انتخاب کیا جائے تو ان میں سے زیادہ افسانے غالبًا کرشن چندر کے ہوں گے۔لیکن اردو کے بہترین دس ناولوں کے نام طئے کیجئے ان میں کرشن چندر کا کوئی ناول جگہ نہ پا سکے گا۔بہت عرصے سے میرے ذہن میں یہ خیال کوندتا رہتا ہے کہ کرشن چندر اردو کا وہ عظیم ناول نگار ہے جس نے کوئی عظیم ناول نہیں لکھا''۔ (ذکر وفکر،ص،۳۸)

گیان چند جین نے کرشن چندر کے بارے میں جو باتیں کی ہیں اکثر لوگ اس سے اتفاق کریں گے۔کرشن چندر نے بیشمار ناول لکھے ہیں لیکن ان کے کسی بھی ناول کو وہ بلندی نصیب نہیں ہوئی جو خود ان کے افسانوں کے حصے میں آئی۔

غیر مسلم ناول نقادوں میں دوسرا اور اہم نام بلراج کومل کا ہے۔انہوں نے کئی ناولوں پر تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔لیکن پریم چند کے ناولوں پر لکھا گیا تنقیدی مضمون بعنوان ''بیسویں صدی میں اردو ناول'' قابل ستائش ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

''گئودان پریم چند کا شاہکار ناول ہے۔اس ناول تک پہنچتے پہنچتے پریم چندر عدم تشدد اور جاگیرداری سے سمجھوتہ کرنے کے رویے سے مایوس ہو چکے تھے۔گئودان کا مرکزی کردار ہوری دبا کچلا ہوا،غریب نادار ان پڑھ کسان ہے۔اس کے برعکس اس کا لڑکا گوبر خوشگوار مستقبل اور روزگار کی تلاش میں شہر کا رخ کرتا ہے۔جہاں وہ مختلف تجربات سے گزرتا ہوا بالآخر بطور مزدور ایک میں بھرتی ہو جاتا ہے۔اس دوران وہ سیاسی جدوجہد میں بھی حصہ لیتا ہے۔دھنیا کے روپ میں پریم چندر نے سیدھی سادی ایک ایسی ہندوستانی عورت کا کردار پیش کیا ہے جس میں بے پناہ انسانی قوت اور ہمدردیوں کا ذخیرہ ہے۔یہ وہ اوصاف ہیں جن کے باعث دھنیا نہ صرف پریم چند کا یادگار کردار بن گئی بلکہ ہندوستانی فکشن کے تناظر میں بھی بطور کردار اس کا اعلی وقار و مرتبہ ہے'' (بیسویں صدی میں اردو ادب،۱۳۰)

بلراج کومل کی طرح کے کے کھلر نے بھی پریم چندر کے ناولوں پر تنقید کی ہے۔خاص کر وہ گودان پر جس طرح تفصیلی گفتگو کرتے ہیں اور اس میں پیش کیے گئے مسائل کو گاؤں کی سرزمین سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں وہ نہایت اہم ہے۔ناول گودان میں جس گاؤں کو پیش کیا گیا ہے کھلر اس کی توضیح وتشریح کرنے سے زیادہ حقیقی گاؤں کا منظر،رہن سہن اور وہاں کی طرز زندگی کو پیش کرتے ہیں اور پھر اس کی روشنی میں گئودان کے گاؤں کو پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ صحیح نتیجہ برآمد کیا جا سکے۔

اردو فکشن اور تنقید میں ایک بڑا نام جوگندر پال کا بھی ہے۔وہ عام طور پر اپنے افسانوں کے لیے اردو دنیا میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں لیکن ان کے تنقیدی مضامین بھی اپنی مثال آپ ہیں۔انہوں نے پریم چند کے ناولوں پر جو تنقید کی ہے اس سے ان کے تنقیدی نظریات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔انہوں نے ناول گئودان کے موضوع اور اس کے فن کو افادیت کے نظریے سے دیکھا اور پرکھا ہے۔یہ بات سچ ہے کہ جب تک تخلیق کار کے ذہن میں باتیں اکٹھی ہوں اس وقت تک وہ اس کی امانت ہے لیکن جب ان نظریات وخیالات کو تخلیق کا رنظرِ قرطاس کر دیتا ہے تو وہ اب قارئین کی امانت بن جاتے ہیں۔اس لحاظ سے گئودان بھی قارئین کی امانت ہے لیکن اس کا کینوس بہت وسیع ہے۔ہر دور کا قاری اسے اپنے دور کے مسائل سے قریب تر پاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ پریم چند

کے دور میں اور ان کے بعد بھی ان کی پیروی میں بے شمار ناول لکھے گئے۔لیکن وہ آفاقیت جو پریم چند کے ناولوں میں موجود ہے دوسرے ناولوں میں کم دکھائی دیتی ہے۔ان کی حساسیت اور انسان دوستی نے ان کی تحریروں میں رنگ بھر دیا ہے۔یہی حساسیت اور انسان دوستی ان کے اور ان کے تابعین کے درمیان خط امتیاز ہے۔

اب تک ہم نے جن نقادوں کے حوالے سے بات کی ہے ان میں سے اکثر و بیشتر نے پریم چند کے ناولوں کو ہی تنقید کا موضوع بنایا ہے۔لیکن بہت سے ایسے غیر مسلم ناقدین بھی ہیں جنہوں نے مختلف ناولوں کی تنقید کی ہے۔اس قبیل میں دیوندر اسر کا مضمون " آگ کا دریا تہذیب کا مرثیہ " بہت اہم ہے۔اس ناول میں اول تا آخر جس طرح تاریخ کو پیش کیا گیا ہے کیا اس میں زمانی تسلسل موجود ہے؟۔آگ کا دریا کے حوالے سے یہ چند سوال ہیں جو ہمیشہ ناقدین کو پریشان کرتے ہیں جس کا جواب دیوندر اسر نے دینے کی بھرپور کوشش کی ہے

''تیسرے دور میں لکھنو اور یورپ میں ان کرداروں کی زندگی مصنف کے پہلے طرز اور کسی حد تک رویے کی بازگشت ہے۔فرد اور سماج کے بارے میں جو نقطۂ نظر ناول میں سرایت ہے وہ اس حصے میں بکھر سا گیا ہے اور ناول اولین اور آخری حصوں سے مطابقت نہیں رکھتا اور نہ ہی تہذیب کے ارتقا اور تسلسل کو ظاہر کرتا ہے۔اور اس میں شک نہیں کہ اس دور کے کردار بھی انسانی اقدار کے حامل ہیں اور وہ سامنتی نظام کے انحطاط کے پس منظر میں نئے ذہن کے نمائندہ ہیں لیکن یہ ذہن دراصل نئے ذہن کا ایک پہلو پیش کرتا ہے۔وہ پہلو جو اس دور میں دوسرے تمام پہلوؤں پر غالب نظر آتا تھا جس کی وجوہ معاشی اور سیاسی زیادہ ہیں تہذیبی کم نئے ذہن کی تعمیر میں سائنس ،فلسفہ،مذہب،نفسیات اور دوسرے سماجی علوم کارفرما رہے ہیں۔ ان کا اثر ان کرداروں کے ذہن پر جیسے پڑا ہی نہیں ،سوائے مارکسزم کے ،لیکن جو ہندوستانی تہذیب کے فطری جوہر کے مطابق نہیں تھا کیونکہ اردو ادب میں یہ غالب رجحان تھا۔ اسی لئے مصنفہ اس دائرے سے باہر جو ذہنی ماحول تھا اس کا شعور رکھتے ہوئے بھی اس کی آمیزش ناول میں نہ کرسکی۔شاید یہ رجحان ہندوستان میں تاریخی کی نظر سے جائز ہو لیکن تہذیب اور اقدار کی رو سے نہیں ان حصوں میں جذبات اور خیالات کی تکرار کا باعث یہی ہے کہ کردار اصلی دھارے سے ہٹ کر بھنور میں پھنس گئے ہیں۔کردار اپنے آپ کو دہراتے ہیں اور ان کی نشونما نہیں ہوتی جب تک کہ وہ ہندوستان واپس نہیں آجاتے۔یہ حصے ناول کے کمزور حصے ہیں۔'' (ادب اور جدید ذہن،ص،۱۹۰)

مذکورہ بالا ناقدین ادب کے علاوہ بہت سے غیر مسلم نقاد ہیں جنہوں نے اردو میں اپنے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ناول کے علاوہ دیگر اصناف سخن یعنی شاعری افسانہ وغیرہ پر بھی بہت سے مضامین لکھے ہیں۔شعری و افسانوی تنقید ہو یا پھر اصولی تنقید گوپی چند نارنگ کا نام ناقابل فراموش ہے ان کے نام کے بغیر تنقید تو کیا اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ غیر مسلم ناقدین نے اپنے گراں قدر خدمات سے ناول تنقید کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ان میں سے اکثر ناقدین نے پریم چند کو ہی اپنی تنقید کا موضوع بنایا ہے اور ان کے مختلف ناولوں کو مختلف جہات سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

☆☆☆

اسما امروز
ریسرچ اسکالر۔ یونیورسٹی آف حیدرآباد
گچی باؤلی' حیدرآباد 046 500

گارسیں دتاسی

گارسیں دتاسی ۲۰ جنوری ۱۷۹۴ء کو جنوبی فرانس کی مشہور بندرگاہ مارسیلز میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ژاں ژوزیف ژاک گارسیں (jean joseph joques garcin) ایک خوشحال تاجر تھا۔ گارسیں دتاسی کے ابتدائی حالات خصوصاً اس کے بچپن اور نوجوانی کے متعلق تفصیلات ابھی تک تاریکی میں ہیں۔ لیکن اتنا پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۱۷ء میں جبکہ وہ ۲۳ سال کا تھا اعلیٰ تعلیم کی غرض سے پیرس آیا یہاں اس نے مدرسہ السنہ شرقیہ (school of orental studies) میں داخلہ لیا۔ یہاں مشہور متشرق سلویستر دتاسی (silvestre de tassy) عربی کا پروفیسر تھا وہ نہ صرف عربی کا بڑا عالم تھا بلکہ فارسی اور ترکی کا بھی بڑا ماہر تھا۔ اس شفیق استاد کی زیر نگرانی گارسیں دتاسی نے چار سال دن رات ایک کر کے عربی فارسی اور ترکی سیکھی اور پیرس کی مشہور سوربون یونیورسٹی سے ان تینوں زبانوں کا ڈپلوما اعزاز سے حاصل کیا۔ اس زمانے میں فرانس میں مشرقی علوم شرقیات سے بڑی دلچسپی لی جا رہی تھی' سلویستر دساسی نے اپنے شاگرد رشید گارسیں دتاسی سے خواہش کی کہ دنیائے اسلام کی ہونے والی بڑی زبان اردو کو سیکھے۔ جو اس زمانے میں (ہندوستانی) کے نام سے مشہور تھی۔ سلویستر دساسی نے اُردو کی اہمیت بھانپ لی تھی۔ وہ انگریزوں کی اس سیاست سے واقف تھا کہ اہل ہند کو ان کی ثقافتی وسرکاری زبان فارسی سے توڑ کر قوم پرستی کی آڑ میں ملکی زبان پر لگایا جائے جس میں ان کا کوئی دینی لٹریچر نہ ہو اور قصہ کہانیوں اور شاعری کی حوصلہ افزائی کر کے عیسائیت کے لئے راہ ہموار کی جائے۔ سلویستر دساسی کے مشورہ پر گارسیں دتاسی نے اُردو سیکھنا شروع کی۔ وہ عربی فارسی اور ترکی سے تو اچھی طرح واقف تھا ان ہی زبانوں کی واقفیت نے اسے اُردو زبان کی مہارت میں مدد بہم پہنچائی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ گارسیں دتاسی نے اُردو سیکھنے میں کتنا وقت لیا۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ اس نے دو سال میں اُردو سیکھی ہے۔ اس نے کسی استاد کی مدد کے بغیر انگریزی کتابوں سے اُردو سیکھی۔ دتاسی انگریزی سے اچھی طرح واقف تھا اور انگریزی میں اُردو سیکھنے کے لئے گرامر اور ڈکشنری وغیرہ موجود تھے ان کی مدد سے اس نے اُردو سیکھی۔

وہ اُردو کی خاطر انگلستان بھی گیا اور وہاں کے اُردو عالموں سے استفادہ کیا۔ وہ اُردو مخطوطات پڑھ سکتا تھا اور روانی سے اُردو بول بھی سکتا تھا۔ دتاسی نے اُردو کے لئے پروفیسر جان شیکسپیر کو اپنا استاد تسلیم کیا ہے مگر اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ باقاعدہ طور پر اس نے انگلستان میں رہ کر شیکسپیر سے اُردو پڑھی ہو۔ اگر چہ اس سے ملنے دتاسی متعدد بار انگلستان گیا۔ دونوں میں بڑی پابندی سے خط وکتابت بھی تھی۔ دتاسی اس سے کتابیں وغیرہ منگواتا رہتا اور علمی مسائل پر مشورے بھی کرتا رہتا تھا جان شیکسپیر اردو کا مشہور پروفیسر گذرا ہے وہ مشہور ڈرامہ نگار ولیم شیکسپیر کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے اپنی اردو تصانیف خصوصاً لغت جو بڑی مقبول ہوئی' سے لاکھوں کمائے اور اس کی زندگی ہی میں اس کے چار ایڈیشن شائع ہوئے۔ حکومت فرانس نے ۱۸۲۸ء میں دتاسی کو عارضی طور پر پروفیسر اُردو مقرر کیا۔ دو سال بعد اسے مستقل کر دیا گیا۔ دتاسی نے تن من دھن سے کام کر کے وہ شہرت حاصل کی کہ یورپ کے دوسرے ممالک ہی نہیں بلکہ خود انگلستان سے طلبہ آتے اور اس کی شاگردی اپنے لئے ضروری سمجھتے۔

گارسیں دتاسی کبھی ہندوستان نہیں آیا لیکن وہ ہندوستانیوں سے ملنے کا ہمیشہ مشتاق رہتا تھا۔ اگر کوئی ہندوستانی پیرس آتا تو وہ بڑا خوش ہوتا۔ اسے اپنا مہمان بناتا۔ اس کے خطبات اور خطوط میں اکثر ہندوستانیوں سے ملاقات کا ذکر ملتا ہے۔ گارسیں دتاسی کو سرسید احمد خان سے بڑی عقیدت تھی۔ جب سرسید کے بیٹے سید محمود پیرس آئے وہ بہت خوش ہوا اور انہیں اپنے گھر مدعو کیا اور اپنی کتابیں تحفتاً پیش کی تھیں۔ جسٹس امیر علی جن کی خود نوشتہ سوانح عمری بہت مشہور ہے' دتاسی سے ملے تھے۔ دتاسی نے اپنے مقالے میں ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ دتاسی ہندوستان کے مصنفین' ناشرین' اخبار اردو کے رسائل کے ایڈیٹروں اور چھاپہ خانہ کے مالکوں سے بھی خط وکتابت کرتا رہتا تھا۔ اس کے تعلقات متعدد علم دوست انگریزوں سے بھی تھے جو اس کو مطلوبہ کتابیں' رسالے اور قلمی نسخوں کی نقلیں بھیجتے رہتے تھے۔ دتاسی کی ساری زندگی علم کے ذوق اور اس کی جستجو میں گذری پیرس آ کر عربی فارسی ترکی اور اردو سیکھنے کے بعد وہ تاحیات اردو زبان وادب کے متعلق تحقیقی مطالعہ میں مصروف رہا۔ دتاسی نے اپنی ساری زندگی اردو زبان کی ترقی وحمایت اور نشر واشاعت میں۔ صرف کر دی اور اپنے خطبات اور مقالات کے ذریعہ یورپ کے اہل دانش کو اس غیر معروف مشرقی زبان کے علمی وادبی خزانوں سے روشناس کراتا

رہا۔ دتاسی اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کا یکساں ماہر تھا۔ اس نے دونوں زبانوں سے متعلق کتابیں لکھیں لیکن ان دونوں میں وہ اُردو کو ترجیح دیتا تھا اور انگریزوں کے اس رجحان کی مخالفت کرتا تھا جو ہندی کو اُردو کے مقابلے میں لا کھڑا کرنے کے لئے روز بروز شدت پکڑتا جارہا تھا۔

دتاسی ایک کم گو خشک اور سب سے الگ تھلگ رہنے والا شخص تھا۔ اسے کتاب کا کیڑا بھی کہہ سکتے ہیں۔ سفید خوبصورت داڑھی اس کی وجاہت میں اضافہ کرتی تھی۔ اس کی صحت بھی اچھی تھی چنانچہ چوراسی (۸۴) سال کی عمر میں بھی وہ پابندی سے اپنا تدریسی کام انجام دیا کرتا تھا۔ اس زمانہ میں وظیفہ پیرانہ سالی کا رواج نہ تھا۔ اس لئے مرتے دم تک دتاسی اپنی خدمت پر مامور رہا۔

دتاسی کا ۶ رستمبر ۱۸۷۸ء کو پیرس میں انتقال ہوا۔ اس کی لاش کو اس کے آبائی وطن مارسیلز لے جایا گیا۔ دتاسی رومن کیتھولک عقائد کا پکا عیسائی تھا لیکن اُس نے دوسرے مختلف مذاہب کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اسے اسلامی تصوف سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب وتمدن اور مذہب کے ہر پہلو سے بخوبی واقف تھا۔ اسے بھگتی تحریک سے بھی دلچسپی تھی بھگتی شعراء کے کلام کا اس نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔

دتاسی کو اس کی زندگی ہی میں شہرت حاصل ہوگئی تھی اُردو دنیا نے اُسکی قدر کی اس کے ہم عصروں نے بھی اسے سر اور آنکھوں پر بٹھایا۔ شاہ فرانس نے اسے اپنے دربار میں باریاب کیا تھا پھر جمہوری دور فرانس میں بھی اس کی قدر افزائی ہوئی اُسے اعلیٰ اعزازات سے نوازا گیا۔ روس، برلن (جرمنی) 'میونخ' ویانا (آسٹریا) فلارنس (اٹلی)' سوئیڈن اور ہندوستان کی علمی اکاڈمیوں اور امریکن اور اورینٹل سوسائٹی نے اسے اپنا اعزازی رکن بنایا۔ پرتگال اور سوئیڈن کی حکومتوں نے اسے اعزازی تحفے دیئے۔ انگریزوں نے بھی اس کی قدر کی اسے سی۔ ایس۔ آئی (کمانڈر اسٹار آف انڈیا) کا خطاب دیا اور اس کی تاریخ ادبیات ہند تیار ہوئی تو اس کی پہلی جلد فرانسیسی ہی میں ملکہ وکٹوریہ نے اپنے نام سے معنون کر کے چھپوائی۔

گارسین دتاسی کے علمی اور ادبی کارنامے: دتاسی کو اُردو، عربی، فارسی، ترکی، یونانی، لاطینی، جرمن اور انگریزی زبانوں میں بڑی مہارت حاصل تھی لیکن اُس نے لکھا صرف اپنی مادری زبان فرانسیسی میں۔ چاہے وہ ترجمے ہوں یا تالیف سب فرانسیسی ہی میں لکھی ہیں۔

ڈاکٹر ثریا حسین پروفیسر اُردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے گارسین دتاسی پر ڈاکٹریٹ کی ہے۔ انہوں نے بڑی تلاش کے بعد دتاسی کی (۱۵۵) کتابوں اور مقالوں کا پتہ چلایا ہے اس تعداد میں (۷۲) تنقیدیں ہیں جو مختلف کتابوں پر کی گئی ہیں (۶) وفات نامے ہیں اور باقی (۷۷) میں سے کچھ کتابیں ہیں اور بڑا حصہ علمی رسائل میں چھپے ہوئے مضامین اور مقالوں کا ہے۔ دتاسی نے اُردو قواعد صرف ونحو تاریخ وادب پر بھی مقالے لکھے اور مختلف شعراء اور نثر نگاروں کی تخلیقات کے انتخاب بھی شائع کئے ہیں۔

اردو زبان وادب پر دتاسی کے چند اہم مقالے: دتاسی اردو کو ہندوستانی کے نام سے یاد کرتا ہے اس نے اس زبان پر ایک اہم مقالہ ''ہندوستان کی عام زبان ہندوستانی کا آغاز وارتقاء'' کے نام سے لکھا ہے۔ اس میں اس نے جدید زبانوں کی ابتداء کے متعلق اس عام نظریے کی توثیق کی ہے کہ یہ جدید زبانیں سنسکرت سے پیدا ہوئیں۔ وہ اردو اور ہندی کا تقابل کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ہندی ادب کا بڑا حصہ مذہبی نوعیت کا ہے جبکہ اُردو نظم ونثر میں برابر اچھی اور مختلف قسم کی چیزیں لکھی جارہی ہیں۔ آخر میں اس نے ہندوستانی ادبیات سے بعض اقتباسات بھی نقل کئے ہیں۔ دتاسی نے ''ہندوستانی کا اولین شاعر سعدیؔ'' کے عنوان سے بھی ایک مقالہ لکھا ہے۔ دتاسی نے شاہ کمالؔ اور تذکرہ قائم کی شہادت پر سعدی دکنی کے بجائے سعدی شیرازی کو اُردو کا اولین شاعر تسلیم کیا ہے بعد میں اس نے اپنی رائے بدل دی اور مسعود سعد سلمان کو اُردو کا پہلا شاعر قرار دیا۔ امیر خسرو کا بیان ہے کہ مسعود سعد سلمان نے ایک ''دیوان ہندوی'' ترتیب دیا تھا مگر اب یہ ناپید ہے۔

دتاسی نے ''ہندوستان میں شاعرات'' کے عنوان سے بھی ایک اہم مقالہ لکھا ہے جس میں چند ہندو اور مسلم شاعرات جیسے میرابائی' چندابائی مہ لقا اور زینت بیگم وغیرہ کا تذکرہ ہے اور ان کے کلام کا فرانسیسی میں ترجمہ بھی پیش کیا ہے۔ دتاسی نے ان خواتین کی شاعری پر تنقید کرنے کے بجائے اپنے مقالے میں ہندو مسلم شاعرات کے فرق پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ مسلم خواتین کے کلام میں پیغمبروں کا ذکر ملتا ہے جبکہ ہندو خواتین کی شاعری اس سے خالی ہے۔

تدوین کلام ولی: دتاسی نے ۱۸۳۳ء میں پیرس سے دیوان ولی شائع کیا تھا۔ اسے ولی کا کلام بہت پسند تھا۔ اس نے ہندوستان سے دیوان ولی کے کئی نسخے منگوائے تھے اور دو تین سال تک اس کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ بعد مقابلہ و تصحیح اس نے بڑی محنت سے ولی کا ایک قابل یادگار دیوان شائع کیا۔ دتاسی کو علم عروض سے اچھی واقفیت تھی اس لئے متعدد نسخوں کے مقابلے کے بعد اس نے ولی کا جو دیوان پیش کیا وہ قابل اطمینان ہے۔ دتاسی نے اس دیوان کے ساتھ چودہ صفحوں کا مقدمہ بھی لکھا ہے اس میں ولی کے حالات اور ان کے کلام کی خصوصیات بیان کی گئیں ہیں۔

غرض دیوان ولی کا یہ فرانسیسی ایڈیشن اکیسویں صدی کے یورپی معیار تدوین کا اچھا نمونہ ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ اس وقت تک ہندوستان میں تحقیق ابھی اس معیار تک نہیں پہنچی تھی۔

تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی: اُردو اور ہندی ادب کی تحقیق و تدوین میں دتاسی کا سب سے اہم کارنامہ اس کی ''تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی'' ہے جس پر اس نے اپنی زندگی کے کئی سال صرف کئے۔ مواد کی فراہمی، تحقیق و تدوین میں صرف تذکروں پر قناعت کرنے کے بجائے اس نے خطوط، مضامین، رسائل، مختلف فہرستوں (کیٹلاگ) قلمی نسخوں اور گرامر کی کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔

دتاسی کو تاریخ ادبیات کی تالیف کا خیال گلکرسٹ کی اُردو قواعد میں تاریخ ادب کے فقدان کی شکایت پڑھ کر ہوا۔ چنانچہ اس نے اس موضوع پر کام کرنے کی غرض سے بڑی تحقیق سے مواد جمع کیا۔ یہ تاریخ اس کا شاہکار ہے۔

تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی کی جلد اول پہلا ایڈیشن ۱۸۳۹ء میں شائع ہوا اور جلد دوم ۱۸۴۷ء میں۔ جلد اول جو فرانس کے سرکاری مطبع سے شائع ہوئی ہے اور ملکہ انگلستان (وکٹوریہ کے نام) معنون کی گئی ہے۔ ''تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی'' نہ صرف یورپی زبانوں میں اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے بلکہ خود اُردو میں اس طرح کا کوئی کام نہیں کیا گیا تھا۔ یہ واقعی بڑے عبرت کا مقام ہے کہ ایک غیر شخص پہلی بار ہندوستان سے ہزاروں میل دور پیرس میں بیٹھ کر ہماری زبان و ادب کی تاریخ لکھ کر ہمارے آگے پیش کرے۔ بعد میں جب دتاسی کی معلومات میں اضافہ ہوا تو اس نے تاریخ کا ایک دوسرا ایڈیشن ۱۸۷۰ء میں تین جلدوں میں شائع کیا۔ دتاسی نے ''تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی'' جس میں (۱۸۳۶) صفحات ہیں ان میں سے تین سو نسخے ہندی ادب کی تاریخ کے لئے مختص کئے ہیں جن میں (۶۰) مصنفین کا تذکرہ ہے اگر چہ ہندی کے بہت سے اہم لکھنے والے اور ان کی کتابیں نظر انداز ہوئی ہیں لیکن اس کے باوجود تاریخ ادبیات ہندوی لکھ کر دتاسی نے ہندی ادب کی بڑی خدمت کی ہے اس موضوع پر یہ اولین کتاب شمار کی جاتی ہے۔ دتاسی کی تاریخ ادب کی اہمیت اردو اور ہندی ادبیات کے اہل زبان کے لئے ہمیشہ برقرار رہے گی۔

دتاسی کی تاریخ ادب صرف فرانس ہی میں نہیں بلکہ انگریز مستشرقین میں بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئی چنانچہ اس کی اشاعت کے بعد ہی انہوں نے ہندوستانی میں اس کے ترجمے کا خیال کیا اور آخر دہلی کالج کے استاد منشی کریم الدین نے اپنی کتاب ''طبقات الشعراء'' اسی فرانسیسی تاریخ کے ایک آزاد ترجمے کے محور پر شائع کی ''دتاسی کی تاریخ ادبیات'' ہندوستان کی سماجی تاریخ، طرز زندگی، عقائد اور روایات اور شعر و ادب کا قیمتی ماخذ ہے۔ دتاسی کی تاریخ ادبیات کا تیسرا ایڈیشن تین جلدوں میں نیویارک (امریکہ) سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا ہے

دتاسی کے سالانہ خطبات: دتاسی ہر تعلیمی سال کے آغاز میں ہندوستان کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں پر ایک خطبہ دیتا تھا۔ یہ خطبات ۱۸۵۰ء سے ۱۸۷۷ء تک ہر سال پابندی سے دیئے گئے صرف ۱۸۵۸ء کے غدر کے موقع پر یہ خطبہ نہیں دیا جا سکا۔ اس طرح دتاسی نے (۲۷) خطبے دیئے۔ ۱۸۵۰ء تا ۱۸۶۹ء کے خطبات کتابی صورت میں پیرس سے ۱۸۷۴ء میں شائع ہوئے بقیہ خطبات علٰحدہ کتابی صورت میں چھپے یہ سالانہ تقریریں ابتدائی خطبات کے نام سے اور پھر ہندوستانی زبان و ادب پر سالانہ تبصرے کے نام سے شائع ہوئیں۔ دتاسی نے اپنے خطبات میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ اُردو کی حمایت کی اور ان لوگوں کی پرزور مذمت کی جو اردو کی جگہ ہندی کو رواج دینا چاہتے تھے۔

دتاسی کی بے لاگ تنقید اور اردو زبان و ادب سے دلچسپی کے سبب اس کے خطبات فرانس کے علاوہ یورپ اور ہندوستان میں بھی بڑے مقبول

ہوئے۔ان کا ترجمہ ہندوستانی اخبارات میں بھی شائع ہوتا۔دتاسی کے تمام خطبات اور تقاریر کا اردو ترجمہ تین جلدوں میں شائع ہوا ہے پہلی جلد جو ۱۸۵۰ء تک کے خطبات پر مشتمل ہے ۱۹۳۵ء میں اورنگ آباد سے شائع ہوئی۔دوسری جلد جو ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۳ء کے خطبات اور تقاریر پر مشتمل ہے دہلی سے شائع ہوئی اور تیسری جلد جو ۱۸۷۴ء سے ۱۸۷۷ء تک کے خطبات پر مشتمل ہے ۱۹۴۳ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ ان خطبات کی اشاعت ثانی چار جلدوں میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی نظر ثانی اور اضافوں کے بعد ۱۹۶۴ء تا ۱۹۷۹ء میں کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ان دونوں اڈیشنوں کی طباعت میں مولوی عبدالحق نے غیر معمولی دلچسپی لی تھی۔

فرانسیسی ہندوستانی لغت: دتاسی کی زیر نگرانی ہندوستانی فرانسیسی اور فرانسیسی ہندوستانی لغت بھی تیار ہوئی ہے جس میں ہندوستان کی دیومالا تاریخ اور جغرافیہ کے الفاظ بھی ہیں یہ لغت ۱۸۷۶ء میں پیرس سے شائع ہوئی۔

صرف ونحو کی کتابیں: دتاسی نے ہندوستانی زبان کی صرف ونحو پر بھی فرانسیسی زبان میں کئی کتابیں اور مقالے لکھے ہیں جس سے اہل فرنچ کو ہندوستانی زبان سیکھنے میں بڑی مدد ملی۔

تراجم: دتاسی نے میر امن دہلوی کی ''باغ و بہار'' اور سرسید احمد خان کی مشہور تصنیف ''آثار الصنادید'' کا فرانسیسی ترجمہ بھی شائع کیا تھا۔

وفات نامے: دتاسی کی تحریروں میں ''وفات نامے'' بھی ملتے ہیں جو زیادہ تر فرانسیسی مستشرقین کے بارے میں ہیں وہ ان مستشرقین سے اپنے ذاتی روابط اور ان کی تخلیقات کا تذکرہ کرتا ہے۔کسی شخص کی وفات پر تنقید مناسب نہیں ہوتی اس لئے وفات ناموں میں تنقید نہیں ملتی۔ان وفات ناموں میں جے جے مارسل اور ایچ ایچ ولسن کے وفات نامے قابل ذکر ہیں۔

غرض دتاسی نے بکثرت علمی وادبی تصانیف اور مضامین لکھے اور انہیں شائع کیا یہ ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔یہ بات بڑی اہم ہے کہ زندگی ہی میں دتاسی کی تصنیفات وتالیفات کی بڑی قدر ہوئی۔چنانچہ بعض کتابوں کے دو دو تین تین اڈیشن شائع ہوئے اور اڈیشن میں اس نے ترمیم اور اضافے کئے۔ضعیفی کے باوجود دتاسی اپنی زندگی کے آخری ایام تک علمی اور ادبی کام کرتا رہا۔وہ نہ صرف اردو کا ماہر تھا بلکہ ہندوستان کی تاریخ نیز ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب وتمدن اور مذہب کے ہر پہلو سے بخوبی واقف تھا۔دتاسی نے تحقیق' تدوین' تنقید وتبصرہ اور تاریخ ادبیات اردو کا ایسا قیمتی ذخیرہ چھوڑا ہے جو عام طور پر ایک فرد واحد کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

دتاسی انیسویں صدی کے اردو منظر نامے کا ایک ایسا گواہ ہے جس کی شہادتوں اور بیانات کی بنیاد پر ہم اُردو شعر وادب' اردو اخبار نویسی (صحافت) سماجیات اور رسوم وعقائد غرض کہ پچھلی صدی کے ہر شعبۂ زندگی کے متعلق کثیر معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر احتشام الدین خرم

مکان نمبر: 11-3-855'

نیو ملے پلی'

حیدرآباد۔ 500 001

Cell: 9885974828

ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی علمی خدمات

ڈاکٹر جان گل کرسٹ کا شمار اُردو زبان کے محققین میں کیا جاتا ہے۔ ان ہی کی کوشش کی بدولت اُردو نثر ترقی کی راہ پر چل پڑی۔ اسی لئے بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے لکھا ہے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو احسان ولی دکنی نے اُردو شاعری پر کیا تھا۔ اس سے زیادہ نہیں تو اسی قدر احسان گل کرسٹ نے اُردو نثر پر کیا ہے۔

حالات:

گل کرسٹ ۱۷۵۹ء میں اسکاٹ لینڈ کے مشہور شہر ایڈنبرا میں پیدا ہوا۔ اس کے ابتدائی حالات تاریکی میں ہیں۔ محققین کا بیان ہے کہ اس نے ایڈنبرا کی مشہور طبی درسگاہ سے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد اس نے کیا کیا یہ بات اب تک نامعلوم ہے۔ ہندوستان آنے سے پہلے وہ ویسٹ انڈیز گیا تھا وہاں اس نے طب کی بجائے نیل کی کاشت کی۔ ویسٹ انڈیز میں کتنا عرصہ رہا؟ وہاں کب گیا تھا اس کی بھی اب تک تحقیق نہ ہوسکی۔

گل کرسٹ ہندوستان میں نومبر ۱۷۸۳ء میں جب کہ وہ (۲۳) سال کا تھا ہندوستان آیا اور یہاں (۲۲) سال یعنی ۱۸۰۴ء تک اس کا قیام رہا۔ وہ ابتداءً فوج میں اسسٹنٹ سرجن مقرر ہوا۔ گل کرسٹ نے سرزمین ہندوستان میں قدم رکھتے ہی یہ محسوس کیا کہ مقامی باشندوں کی زبان سے واقف ہوئے بغیر نہ تو اس کے لئے اپنے فرائض کی بجا آوری ممکن ہے اور نہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مفاد میں کوئی قابل قدر کارنامہ انجام دے سکے گا۔ چنانچہ اپنے اس احساس کے تحت گل کرسٹ نے پوری کوشش کے ساتھ ہندوستانی زبان کا مطالعہ شروع کیا جیسے جیسے اس پر اس زبان کی خوبیاں کھلتی گئیں اس کی دلچسپیاں بھی بڑھتی گئیں اور وہ اس میدان میں ترقی کرتا گیا۔ کچھ ہی دنوں میں اس کی حیثیت طالب علم سے بڑھ کر استاد اور پھر اسکالر کی ہوگئی۔ ہندوستانی زبان کے مطالعے کے ابتدائی زمانے ہی میں اسے اس زبان کے قواعد اور لغت سے متعلق کتابوں کی کمی شدت کے ساتھ محسوس ہوئی۔ اس کام کی تکمیل کے لئے اس نے ایک سال کی رخصت لی۔ جنوری ۱۷۸۵ء میں رخصت کی منظوری پر اس نے لکھنؤ فیض آباد الہ آباد اور بنارس وغیرہ کا سفر کیا تا کہ ہندوستانی زبان کے مختلف پہلوؤں سے واقفیت حاصل ہو جائے اور قواعد ولغت کے لئے مواد جمع کیا جاسکے۔

اس نے ہندوستانی لباس کا استعمال شروع کیا اور ڈاڑھی بھی چھوڑ لی اور ہندوستانیوں میں گھل مل گیا۔ اور اس بات کی کوشش کی کہ ہندوستانی زبان کے تقریباً سارے مشہور و معروف الفاظ اس کی زبان پر چڑھ جائیں۔ گل کرسٹ کی ان کوششوں کا نتیجہ انگریزی ہندوستانی لغت (A Dictionary of English & Hindustani) کی صورت میں ۱۷۸۶ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ لغت کی پہلی جلد تھی۔ چند سال بعد اس کی دوسری جلد ۱۷۹۰ء میں شائع ہوئی۔ ۱۷۹۸ء میں اس لغت وقواعد کا ضمیمہ شائع ہوا۔ اور اسی سال ایک اور کتاب مشرقی زبان داں Oriental Linguist شائع کی۔

گل کرسٹ فورٹ ولیم کالج میں:

جولائی ۱۸۰۰ء میں لارڈ ویلزلی گورنر جنرل ہندوستان نے نووارد انگریزوں کو ہندوستانی زبانوں اور معاشرت سے واقفیت کے لئے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا اور گل کرسٹ کو ہندوستانی شعبہ کا صدر مقرر کیا۔ کیونکہ گل کرسٹ کو ہندوستانی زبان پر مہارت حاصل تھی۔ اسے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا تجربہ فورٹ ولیم کالج میں آنے سے پہلے ہی ہو چکا تھا اور اس کی بڑی شہرت تھی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ گل کرسٹ کی بدولت فورٹ ولیم کالج اور اس کا ہندوستانی شعبہ اُردو کی لسانی اور ادبی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ گل کرسٹ اگست ۱۸۰۰ء سے فروری ۱۹۰۴ء تقریباً چار سال تک ہندوستانی شعبہ کا صدر رہا۔ اس قلیل عرصہ میں اس نے اپنے شعبہ کو بڑی ترقی دی۔ درس و تدریس کے

علاوہ اس نے کتابیں لکھنے اور مرتب کرنے کا باقاعدہ کام شروع کیا۔اس مقصد کے لئے اس نے اپنے شعبہ میں مصنفین ومترجمین کا تقرر کیا۔منشی اور ماتحت منشی رکھے۔۱۸۰۲ء میں ہندوستانی شعبہ کے عملے کی تعداد (۴۸) تک پہنچ گئی تھی۔اس نے کالج کے تحت ایک چھاپہ خانہ بھی قائم کیا۔اور اُردو ٹائپ سے طباعت شروع کی۔نو وارد انگریزوں کو ہندوستانی لب ولہجہ اور تلفظ سمجھانے کے لئے قصہ خواں مقرر کئے جو دلچسپ قصے سنا کر اُردو بولنے اور پڑھنے کے لئے دلچسپی دلاتے تھے اور ہندوستانی مصنفین کو ان کی بہترین تصانیف پر انعام دلوایا۔اس نے ایسے مصنفین کو بھی انعام دلوایا جو کالج سے وابستہ نہیں تھے۔اس طرح اس کے دور میں (۴۴) کتابوں پر انعامات دیئے گئے۔گل کرسٹ نے کتابوں کی طباعت کے لئے امداد دیئے جانے کی راہ نکالی اور کتابوں کو فروخت کرنے کا پروگرام بنایا۔غرض فورٹ ولیم کالج میں گل کرسٹ کا دور ہندوستانی شعبے کے لئے تصنیف وتالیف اور تعلیم کے اعتبار سے بڑا اہم اور مفید رہا۔اسی کی سر پرستی اور رہنمائی میں آسان عام فہم اُردو نثر لکھنے کی ابتداء ہوئی۔اسی نے اُردو کے ادیبوں کی خدمات حاصل کیں اور ان سے ایسی کتابیں لکھوائیں جن میں سے بعض ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

گل کرسٹ ایڈنبرا میں:

گل کرسٹ فروری ۱۸۰۴ء میں خرابی صحت کی بناء پر فورٹ ولیم کالج کی خدمات سے استعفیٰ دے کر انگلستان چلا گیا۔کچھ عرصے تک ایڈنبرا میں مقیم رہا۔اس زمانے میں اس نے کسی معاوضے کے بغیر ہندوستانی زبان سے متعلق کئی لکچر زدیئے اور اپنی پرانی کتابوں پر نظر ثانی کی۔۳۰۔اکتوبر ۱۸۰۴ء میں اسکوا یڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔

گل کرسٹ لندن میں:

گل کرسٹ ۱۸۰۶ء میں لندن منتقل ہوا۔اور وہاں ہندوستانی زبان کی تعلیم دینے لگا۔پھر لندن میں ایک اورینٹل انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا تو اس میں ہندوستانی زبان کا پروفیسر مقرر ہوا۔

ڈاکٹر جان گل کرسٹ آخری زمانے میں پیرس چلا گیا۔وہیں ۹۔جنوری ۱۸۴۱ء کو اس نے وفات پائی۔

گل کرسٹ کی تصانیف:

گل کرسٹ صاحب قلم تھا۔اس نے اُردو زبان، اس کی قواعد اور لغت پر اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھی ہیں۔ان کا تذکرہ درج ذیل ہے۔

انگریزی ہندوستانی لغت: گل کرسٹ نے انگریزی اور ہندوستانی لغت کی دو جلدیں شائع کی تھیں۔پہلی جلد ۱۷۸۶ء میں اور دوسری جلد ۱۷۹۰ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔اس لغت میں الفاظ کے معنی رومن اور فارسی رسم الخط میں دیئے گئے ہیں۔اکثر جگہ اشعار بطور حوالہ درج ہیں۔یہ اشعار بھی رومن حروف میں ہیں۔اس لغت کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔بعد میں اس کے کئی ایڈیشن لندن میں شائع ہوئے۔

ہندوستانی زبان کی قواعد: گل کرسٹ نے ۱۷۹۶ء میں ہندوستانی زبان کی قواعد انگریزی میں شائع کی۔بعد میں بہادر علی حسینی نے ''رسالہ گل کرسٹ'' کے نام سے اس کا خلاصہ اُردو میں مرتب کیا جو ۱۸۰۲ء میں شائع ہوا۔خود گل کرسٹ نے بھی مبادیات ہندوستانی The Hindustani Principles کے نام سے اس میں حذف واضافہ کے ساتھ اُردو ترجمہ بھی ۱۸۰۳ء میں شائع کیا تھا۔اس کتاب میں اُردو کے ممتاز شعراء کے لاتعداد اشعار دیئے گئے ہیں۔اس کے علاوہ شیکسپیئر کے دو ڈراموں ہنری ہشتم اور ہملٹ کے ایک ایک حصہ کا اُردو ترجمہ بھی شامل ہے۔یہ مغربی ڈراموں کا پہلا اُردو ترجمہ ہے۔

ضمیمہ (لغت وقواعد کا) Appendix: گل کرسٹ نے لغت وقواعد کا ایک ضمیمہ Appendix کے نام سے ۱۷۹۸ء میں رومن رسم الخط میں کلکتہ سے شائع کیا تھا۔اس میں گل کرسٹ نے اپنے قیام ہندوستان کی سرگذشت بھی بیان کی ہے جو دلچسپ اور اہم ہے۔

مشرقی زبان داں: The Oriental Linguist: گل کرسٹ نے نو آموزوں (مبتدیوں) کے لئے ''مشرقی زبان داں'' کے نام سے ایک

کتاب ۱۷۹۸ء میں کلکتہ سے شائع کی تھی۔اس میں ہندوستانی زبان کے قواعد انگریزی ہندوستانی اور ہندوستانی وانگریزی لغت کے ساتھ عام فہم اور مفید مکالمے، قصے، نظمیں اور فوجی آئین کے کچھ حصوں کا ترجمہ بھی ہے اور آخری حصہ نظم ہے جس میں اُردو و فارسی اشعار اور ان کا انگریزی ترجمہ دیا گیا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا ترمیم شدہ ایڈیشن ۱۸۰۲ء میں فورٹ ولیم کالج کے خرچ سے شائع ہوا تھا۔

معلم ہندوستانی The grand popular of India:

گل کرسٹ کی کتاب ''معلم ہندوستانی'' کا موضوع ہندوستانی قواعد ہے۔اس کتاب کی ابتداء میں ایک طویل مقدمہ ہے جس میں ہندوستانی زبان کی ابتداء اور اس کے مختلف ناموں پر مفصل بحث کی گئی ہے۔یہ کتاب ۱۸۰۲ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۰۸ء میں لندن میں شائع ہوا۔۱۸۲۰ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن بھی لندن سے شائع ہوا۔معلم ہندوستانی The Strangers Est. India guide to the Hindustani) جو اُردو کے نام سے بھی مشہور ہے۔یہ کتاب ۱۸۰۲ء میں شائع ہوئی۔

:The Hindi Arabic Mirror

گل کرسٹ نے اس کتاب میں ہندوستانی اور فارسی زبان میں جو عربی الفاظ داخل ہو گئے ہیں ان سے بحث کی ہے اور ان کے سیکھنے کا آسان قاعدہ بھی بتایا ہے۔یہ کتاب بھی ۱۸۰۲ء میں شائع ہوئی۔

ہندوستانی علم الہجہ کا خاکہ:

اس کتاب میں گل کرسٹ نے ہندوستانی علم الہجہ سے بحث کی ہے۔یہ کتاب جو ۱۸۰۲ء میں شائع ہوئی Practical out lines or sketch of Hindustani or the by in Roman character کے ناموں سے بھی مشہور ہے۔

بیاض ہندی : The Hindi Manual

گل کرسٹ نے ۱۸۰۲ء میں بیاض ہندی Hindi Manual کے نام سے ایک کتاب دو جلدوں میں کلکتہ سے شائع کی تھی۔یہ کتاب فارسی، رومن اور ناگری سنسکرت ہندی رسم الخط میں لکھی گئی ہے۔اس میں فورٹ ولیم کالج کے منشیوں کی بعض کتابوں جیسے باغ و بہار، شکنتلا، سنگھاسن بتیسی، طوطا کہانی، نثر بے نظیر، اخلاق ہندی، باغ اُردو وغیرہ کے اقتباسات دئے گئے ہیں۔

اتالیق ہندی : The Hindi Moral Precentor

گل کرسٹ نے مشہور فارسی شاعر سعدی شیرازی کے ''پند نامہ'' کا منظوم انگریزی ترجمہ کیا تھا جو ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا۔اس کے ساتھ گلیڈون کا انگریزی نثری ترجمہ اور مظہر علی خان ولا کا منظوم اُردو ترجمہ ہے۔گویا یہ کتاب سعدی کے پند نامہ کا انگریزی اور اُردو تراجم کا مجموعہ ہے۔اس کتاب کو گل کرسٹ نے اپنے مقالے کے ساتھ شائع کیا تھا۔

انگریزی اور ہندوستانی مکالمے: اس کتاب میں انگریزی کے روزمرہ مکالموں کا ترجمہ اُردو میں دیا گیا ہے۔یہ کتاب پہلی بار ۱۸۰۳ء میں کلکتہ سے پھر ۱۸۰۹ء میں ایڈنبرا سے شائع ہوئی۔اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن لندن سے شائع ہوا جس کی ترتیب و تدوین میں تھاسی روبک Thesee Rue buck نے بھی مدد کی تھی۔

غرض مندرجہ بالا کتابوں سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ گل کرسٹ نے ہندوستانی اُردو زبان کی ترقی اور اشاعت سے خصوصی دلچسپی لی اور اس زبان کی قواعد اور لغت میں اتنا مواد چھوڑا جو نو وارد انگریزوں کی ضرورتوں کے لئے کافی ہی نہیں بلکہ بڑا مددگار ثابت ہوا۔

☆☆☆

سعید الدین فرخ

ورڈ ماسٹر کمپیوٹر سنٹر، روبرو مسجد ابراہیم، نیو ملے پلی، حیدرآباد۔ 001 500 Cell:7893573855

مندرجہ ذیل غیر مسلم ادباوشعراء،صحافی اور غیر مسلم اردو اسکالرس کے نام ''اردو کے نان مسلم شعراوادیب'' مرتبہ ڈاکٹر جگدیش مہتہ درد حصہ اول جولائی 1981ء وحصہ دوم اکتوبر 1975ء مطبوعہ نیو پبلک پریس دہلی وجمال پرنٹنگ پریس جامع مسجد دہلی سے نقل کیے گئے ہیں۔ قارئین اور عوام الناس کی معلومات کے لئے یہ نام یہاں درج کیے جا رہے ہیں:

روشن لال وڈیرہ نادان، ونود شنکر شرما اشک، منوہر لال آہوجہ بیدل، شام سندر جوشی اثر، ستیہ پال بیدار، اوم پرکاش بجاج، بنارسی داس مفلس، وڈیارتن عاصی، شوراج بہار، بسنت کمار بسنت، آنند درپن، ایس۔ پی۔ سنگھ سوز، سریش چندر شوق، برہمانند جلیس، سلیکھ چند جین قابل، ہری ونش اینجہ جمال، کرشن کمار طور، راجندر سنگھ پتنل راج، بنارسی داس زخمی، ہردیال سنگھ گل پردیسی، جگدیش راحل، اندر جیت سنگھ تلسی، نندہ راہی، پریم دت گلاٹی چاند، کلونت سنگھ جانی، چرنجی لال کوہلی نور، بی ایل چندن، دیوان تصور، آزاد گلاٹی، رام لبھایا بخشی ساحر، بھگوان داس اسیر، دھرم سروپ، راج پال اشک، جوالا پرشاد شاہی، ڈی۔ این۔ ملک راز، آزاد سونی پتی، روشن پٹیالوی، رلیا رام رتن، منوہر لال منوہر، آنند موہن زتشی گلزار، خوشحال چند خورسند، سکھدیو پرشاد سنہا بسمل، جے چند پریم، کے۔ بی۔ ماتھر کیلاش ماہر، اوتم چند شرر، ستیہ پرکاش مہتاب، ہنس راج آہوجہ طاہر، صابردت، آر۔ آر۔ راٹھور اجنبی، آر کے شوپوری تابش، سچدانند شرما یوس، سریندر پنڈت سوز، گردھاری لال شرر، کالی چرن اثر، ہیرا لال فلک، پریم پال اشک، ہربنس سنگھ تیج، لیکھراج پرواز، امر سنگھ نشاط، درشن کمار حسرت، دھیرج پرشاد بھٹنا گر کشتہ، رگھوناتھ سہائے امید، سہنیہ لتا ورنا، کے۔ سی۔ بسمل، شری ناگیش بھٹنا گر راز سکندری، شری کانت چوہدری، رام ناتھ رشک، جگدیش ناقص، جیون لال گوہر، بی۔ ایس۔ تلواڑ بیتاب، پروفیسر کنول ایم اے، ہربنس لال، رام ناتھ سرور، بلراج کومل، فتح چند نسیم سرحدی، کنول لال ڈاگر، نارائن پرشاد، کرشن متل معراج، کندن گوڑگانوی، پریم کمار جوہر نصیب، یوگ گپتا راہی، رمن پرشاد سنہا، کرشن لال شرما غمگین، سنتو کھ سنگھ معصوم، ڈی۔ راج کنول، ایس۔ این۔ داس بسمل، بھگوان داس اعجاز، رام لال فکر تونسوی، جگدیش راج فگار، سنتو کھ سنگھ ندیم دولتاوی، کنور جگدیش کمار انسان، کملا پت سہائے ماہر بلگرامی، دلیپ کمار طالب، دید دیوانہ، مدن موہن موہن آنکی پوری، راجندر ناتھ رہبر، گوردھن راس شاکر، دیپ جالندھری، بالکشن کپور، کرشن کنول ہریانوی، منوہر لال دل، مدن ورکت، نریش چندر ساتھی، رمیش پوری طوفان، ایس۔ پی۔ سکسینہ بقا، رام پرکاش راہی، کرشن قمر، حکم چند منظر، رانا بھگوان داس رانا، نوبت رائے شوخ، اقبال کرشن، ایم۔ ایم۔ بھلہ، دلیر شیرانی، منوہر لال ہادی، شرون کماردریا، اودھے بھانو ہنس، گورچرن سنگھ دیپک، اوشا اعجاز، بشمبر لال شاد، موہن سیرت اجمیری، اوم عزیز، طلعت عرفانی، نیر آتمی، اندر جیت لطف، راجیش گوہر، سرجیت سنگھ بخشی، برج لال کوہلی نازاں، بلجیت سنگھ سجاد، رام کرشن ساجن، گوردیپ سنگھ دیپ، منگت سنگھ حبیب، بابو رام صفا، ارجن دیو رشک، شام لال ماہر، اوم پرکاش لاغر، پریم شنکر وحشی، کرشن کمار چمن، لکھپت رائے مخمور، جی ایم سنگھ گل، گیان سنگھ شاطر، کرنل بی۔ کے۔ نارائن بیتاب، جسونت رائے اثر، رادھا رمن جوش بدایونی، پرتپال سنگھ بیتاب، آر۔ ایس۔ راجہ دیپک پوری، رامیشور ناتھ شرما، بچن بابو، بودھ راج ظفر، مہندر سنگھ تیاگی رشک، اخگر پانی پتی، سنتوش کمار کوکب، راج بدایونی، جے رام داس فلک، کرشن ادیب، کرشن بہاری نور، ایس۔ پی۔ تفتہ، گوہر سیلانی، ودیارتن ساگر، اوم پرکاش نسیم، لکشمی نرائن فارغ، تاراچند رستوگی طاہر، تمنا لدھیانوی، موتی لال یوپلی موتی، امر سنگپ عارج، نقش ساہنی، گوگل چند شوری حسرت، کشور کیلاش پوری، کرشن پرویز، شانتی کپور اعجاز بہاولپوری، نارائن پرشاد شاد، دینا ناتھ مہتہ، برج لال بھردواج منظر، بھگوان داس برق، ہردی رام جودت، جگن ناتھ خوشتر، طوطا رام شایاں، رنگ لال چمن، ولی رام ولی، منشی مینڈو لال زار، ٹیک چند بہار، کرشن سہائے ہتکاری وحشی، پنڈت چکبست لکھنوی، درگا سہائے سرور جہاں آبادی، منشی مہاراج بہادر برق دہلوی، سورج نارائن مہر دہلوی، حکیم لکشمی نارائن جوہر بدایونی، موجی رام موجی، بابو شگن لال روشن پانی پتی، ہرگوپال تفتہ، شنکر لال ساقی، جواہر ناتھ ساقی، چوہدری جگت موہن لال رواں، پریم شنکر فرحت دہلوی، بھیم سین سرشار سیلانی، شیام سندر لال برق سیتاپوری، پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی، مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد، مہاکوی ودیاپتی، پروفیسر تلوک چند محروم اور بھی دیگر شعراء ادباء کی طویل فہرست ہے جن کا احاطہ اس وقت ممکن نہیں ہے۔ بہرحال کاروان اردو میں جہاں مسلمان اردو ادیب، شعراء، صحافی اور اسکالرس ہیں تو وہیں دیگر اقوام اور مذاہب کے ماننے والے ہندوستانی اور غیر ملکی افراد بھی برابر کے شریک ہیں۔ جن میں یورپی ممالک سے گارساں دتاسی، جان گل کریسٹ، اینا میری شموئل اور بھی کئی اسکالرس ہیں جو اردو زبان وادب کے ماہر ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کی یونیورسٹیوں سے کئی غیر مسلم طلباء نے اردو میں پی ایچ۔ ڈی کیا ہے۔

AN OFFICIAL ORGAN OF TELANGANA STATE URDU ACADEMY

Vol. 07 No. 10 October 2022

RNI Regn. No. : TELURD/2015/32622

Date of Publication : 15th of every month

RNP No. H-HD-GPO/059/2020-2022

Posting Date : 18th, 19th and 20th of every month

Accredited under the
University Grants Commission (UGC) Care-List

SPECIAL ISSUE
NON-MUSLIM WRITERS & POETS OF URDU

جناب محمد خواجہ مجیب الدین صدر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی نے
جناب کے چندرا شیکھر راؤ عزت مآب وزیر اعلیٰ ریاست تلنگانہ سے ملاقات کی۔اس موقع پر لی گئی تصویر

Regd. Office : Telangana State Urdu Academy,
4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad - 500 001 T.S. (India)
Phone: 040-23237810, 040-66362931 Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
ISO 9001 : 2015 Certified Organisation Website: www.urduacademyts.com